قرآنِ مبین کے ادبی اسالیب

عبیداللہ فہد فلاحی

Q
297.16
ف 848 ق
95687

Marfat.com

SCANNED

قرآن مبین کے ادبی اسالیب

ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

Marfat.com

۲۹۷٫۱۶
ف ۸۴۸

مطبوعات ہیومن ویلفیر ٹرسٹ (رجسٹرڈ) نمبر ۴۷۹
© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

۹۵۶۸۷

نام کتاب : قرآن مبین کے ادبی اسالیب
مصنف : ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی
صفحات : ۲۰۸
ناشر : مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز
ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۵
فون: ۶۹۱۱۶۵۲، ۶۳۱۷۸۵۸ فیکس: ۶۸۲۰۹۷۵
E-Mail : mmipub @ nda.vsnl.net.in

اشاعت :
باراوّل: اگست ۲۰۰۰ء ۱,۰۰۰

قیمت: -/۵۰ روپے

QUR'AN MOBEEN KE ADABI ASALEEB (Urdu)
By Dr. Obaidullah Fahad Falahi

Price : Rs. 50.00

Marfat.com

فہرست

حرف آغاز	۷
صاحب لسان العرب کی رائے	۷
علامہ ابن خلدون کی رائے	۸
اسلوب کی لازمی خصوصیات	۱۱
وضاحت	۱۱
وضاحت فکر	۱۱
وضاحت ترکیب	۱۳
قوت تاثیر	۱۴
قوت تصویر	۱۵
قوت ترکیب	۱۶
جمال ورعنائی	۱۶
سلبی گوشہ	۱۷
ایجابی گوشہ	۱۸
موضوع پر اسلاف کی خدمات	۱۹
اسلوب قرآن اور اس کی خصوصیات	۲۱
قرآن مبین کے بعض اسالیب	۲۵
۱۔ عود علی البدء	۲۵
۲۔ علی سبیل المشاکلہ	۲۹
۳۔ نہی کے ساتھ قید	۳۳
۴۔ تعریف	۳۷
۵۔ تخلیص	۳۹

Marfat.com

۶۔	تکرار	۴۳
	کیا تکرار کا یہ اسلوب بنی اسرائیل کے لیے خاص تھا؟	۵۰
	جاہلی شعراء اس اسلوب سے مانوس تھے	۵۱
	اس اسلوب کے بعض فوائد	۵۴
	قصوں کی تکرار	۶۰
	تکرار کی اصل حکمت	۶۱
	قصہ آدمؑ وابلیس	۶۲
	سورہ اعراف میں	۶۳
	سورہ حجر میں	۶۵
	سورہ بنی اسرائیل میں	۶۷
	سورہ طٰہٰ میں	۶۸
	سورہ ص میں	۶۹
	سورہ کہف میں	۷۰
	قصہ ابراہیمؑ مختلف سورتوں میں	۷۱
	سورہ انعام میں	۷۳
	سورہ توبہ میں	۷۳
	سورہ ہود میں	۷۴
	سورہ ابراہیم میں	۷۶
	سورہ مریم میں	۷۷
	سورہ انبیاء میں	۷۷
۷۔	قسم	۷۹
	قسم کا مقصد	
	قرآن پاک سے مثالیں	
	مقسم علیہ کی مختلف شکلیں	
	توحید	
	اثبات رسالت	

Marfat.com

قرآن کی حقانیت پر دلیل	۸۹
آخرت کی دلیل	۹۰
انسانوں کی ناشکری پر دلیل	۹۰
تحکیم رسول پر دلیل	۹۰
قسم کی بلاغتیں	۹۱
۸۔ تخاطب	۹۳
چند ضروری نکات	۹۹
التفات	۱۰۱
التفات کے فوائد	۱۰۳
۹۔ قِران و وصل	۱۰۹
۱۰۔ حذف	۱۱۱
مواقع حذف	۱۱۱
۱۱۔ استفہام	۱۳۱
۱۲۔ نفی	۱۴۳
۱۳۔ حال	۱۵۱
۱۴۔ وصف	۱۵۵
۱۵۔ اعتراض	۱۶۱
۱۶۔ تکمیل	۱۶۷
۱۷۔ عطف بالواؤ	۱۷۱
۱۸۔ ابہام کے بعد توضیح	۱۷۵
۱۹۔ تنکیر کے کچھ خاص اصول	۱۷۹
خلاصہ	۱۸۵
حواشی و تعلیقات	۱۸۹
کتابیات	۲۰۱

Marfat.com

Marfat.com

حرف آغاز

جب اسلوب کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو معاً ایک ایسے لفظی عنصر کی تصویر ذہن میں آتی ہے، جو کلمات، جملوں اور عبارتوں سے مرکب ہے بلکہ بسا اوقات اسے دوسرے علوم وفنون سے کاٹ کر صرف ادب تک محدود سمجھ لیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مفہوم صحیح ہونے کے باوجود جامع اور ہمہ گیر نہیں ہے اس لیے کہ یہ لفظی تصویر پایہ دار زندگی نہیں حاصل کر سکتی۔ یہاں تو لغوی نظام سے آگے ایک ایسے معنوی نظام کی بھی ضرورت ہے، جو خود مضمون نگار اور مصنف کے ذہن میں موجود ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ مرتب و منظّم الفاظ کے وجود سے پہلے عقل و خیال کی مرکزیت اور فکر و نظر کی تنظیم ضروری ہے۔

ایک مشکل یہ بھی ہے کہ لفظ اسلوب مختلف میدانوں اور جہتوں میں قدر مشترک بن کر رہ گیا ہے علماء اور محققین اسے ایک علمی طریقہ کار کے معنی میں بولتے ہیں، ادباء و شعراء اسے فنّ ادب میں محصور سمجھتے ہیں اور موسیقی کار اسے نغموں کی ترتیب اور صوتی ہم آہنگی کے لیے دلیل راہ تصور کرتے ہیں۔

صاحب لسان العرب کی رائے:

علامہ ابن منظور نے اپنی کتاب میں اسلوب کی تعریف اس طرح کی ہے:

"کھجوروں کی کیاری کو اسلوب کہتے ہیں، ہر وسیع اور لمبا راستہ بھی اسلوب کہلاتا ہے۔ معنوی مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے انتم فی اسلوب سوء، تم نے غلط طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ اسلوب اس عام شاہ راہ کو بھی کہتے ہیں، جس پر انسان چلتے ہیں اسلوب کے معنی فن کے بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے أخذَ فلانٌ فی أسالیبَ من القول ای أفانین

Marfat.com

منه، یعنی فلاں نے مختلف فنون سے دلچسپی لی"(۱)

صاحب لسان العرب کی اس تعریف کی روشنی میں ہم اسلوب کی دو قسمیں قرار دے سکتے ہیں:

۱۔ حسّی اسلوب جو لفظ کی اولین ساخت کی نمایندگی کرتا ہے۔

۲۔ معنوی اسلوب، جو لغوی ساخت کا اگلا قدم ہے اور جہاں کلمات حسّی مفہوم کے دائرے سے نکل کر ادبی و نفسی معانی کے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔

چناں چہ اسلوب کلام کا ایک فن ہے، خواہ وہ قصص و واقعات کی شکل میں ہو خواہ بالمشافہ گفتگو کی شکل میں تشبیہ، مجاز اور کنایہ کا پیراہن زیب تن کیے ہوئے ہو۔ یا امثال و حِکم کے لباس میں جلوہ گر ہو۔ اس مفہوم کے اعتبار سے اسلوب کا مفہوم قدرے وسیع ہو جاتا ہے اس لیے یہاں لفظی عنصر سے آگے بڑھ کر معاملہ اس فن تک جا پہنچتا ہے جس کا سہارا ایک ادیب تاثیر و تفہیم کے لیے لیتا ہے۔

علاّمہ ابن خلدون کی رائے:

جب ہم مقدمہ ابن خلدون کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ہمیں چند مزید قیمتی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ ادبی اسلوب کی تشکیل میں علمی و فنی نقطہائے نظر میں بڑا زبردست فرق ہے۔ نحو، بلاغت اور عروض کے علوم سے ہمیں صرف اتنا فائدہ ہوتا ہے کہ ان سے کلام کی اصلاح میں اور قوانین نظم و نثر سے اسے ہم آہنگ بنانے میں مدد ملتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک طالب علم ان علوم سے واقف ہو لیکن اس کی انشاء پردازی ادب کے اعلیٰ مقام پر نہ رکھی جا سکتی ہو یا یہ کہ زیادہ سے زیادہ اس کو یہ فائدہ ہو کہ اس کا کلام صحیح ہو جائے، لیکن کیا اسے حسن کلام اور تاثیر کلام کے بلند مقام پر فائز بھی کیا جا سکتا ہے؟ یہ قطعی طور پر ضروری نہیں ہے۔ لیکن خوب صورت اور شیریں اسلوب کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس کے لیے طبعی ذوق اور جگر کاہی و ممارست درکار ہے۔

۲۔ اسلوب دراصل وہ ذہنی تصویر ہے، جو ذہن و دماغ پر حاوی ہو جاتی ہے اور مطالعہ و استفادہ سے ذوق پر اثر انداز ہو جاتی ہے۔(۲) اسی ذہنی تصویر کی نمایندگی وہ لفظی مظاہر کرتے ہیں، جن کو

---

(۱) لسان العرب، ابن منظور، بیروت ۱۹۵۵ء، ج:اول، ص: ۴۷۳

(۲) دیکھیے المثل السائر، ص: ۳۰۰، کتاب الصناعتین، ص: ۱۴۷

Marfat.com

ہم اسلوب کہتے ہیں۔

۳۔ یہ ذہنی تصویر جو اسلوب کی اولین بنیاد ہے۔نہ جزئی معانی کا نام ہے نہ مستقل جملوں کا بلکہ یہ ایک طریقۂ تعبیر ہے جسے متکلم اختیار کرتا ہے۔

۴۔ نظم و نثر میں لفظی و معنوی امتیازات دراصل اسلوب کی وجہ سے ہیں۔ نظم، وزن اور قافیہ وغیرہ کے ذریعہ ممتاز ہو جاتی ہے اور ہر شعر اپنے معنی و مفہوم میں مستقل حیثیت رکھتا ہے اور یہ اہل عرب کی خصوصیت تھی۔اسی طرح نثر کی خصوصیت موازنہ و تشابہ تھی بسااوقات اس میں سجع وارسال کی تقلید بھی کی جاتی تھی۔

اس سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ زمانہ قدیم سے اسلوب سے مراد وہ صوری گوشہ لیا جاتا ہے جو تعبیر و اظہار کا طریقہ تھا جسے ایک ادیب اور مصنف اظہار مافی الضمیر کے لیے اختیار کرتا ہے۔دراصل اسلوب نام ہے "تحریر کے طریقے کا، انشاء پردازی کے سلیقے کا، تعبیر و تشریح کے لیے الفاظ کے انتخاب و ترتیب کا یا نظم کی قسموں کا۔اور یہی ادبی اسلوب کی تعریف ہے۔(۱)

دوسرے علوم و فنون) سے قطع نظر خود ادب میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایجاز و اطناب، سہولت و غرابت جمال و تنافر وغیرہ کے ذریعے عبارتوں کی تشکیل میں تصرف و اختلاف ہوتا ہے لیکن ان ساری چیزوں سے پہلے تصریف و اختلاف ایک اور جگہ ہوتا ہے اور وہ ہے افکار کا انتخاب ان کی منطقی یا منتشر ترتیب، ان کی وضاحت یا ابہام، ان کی صحت یا خطا وغیرہ کا میدان اور انھیں طریقۂ استقرار یا طریقۂ استنباط کے مطابق ڈھالنا پھر انھیں تخیل و تصویر کے قالب میں پرونا کہ مصنف تشبیہ کا طریقہ زیادہ استعمال کرے گا یا استعارے کا یا کنایہ کا؟ اور اس سلسلے میں اس کی تقلید و اجتہاد کی کیفیت کیا ہے؟ یہ وہ تمام نکات ہیں جہاں مضمون نگار، ادیب اور مصنف ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور ہر ایک اپنا اسلوب لے کر سامنے آتا ہے۔

مثال کے طور پر بڑھاپے کا تصور ہے، دیکھیے تین شعراء اسے اپنے اپنے اسلوب میں کس طرح بیان کرتے ہیں۔

معرّی کہتا ہے:

والشیب ازھار الشباب فمالہ یخفی، وحسن الروض فی الازھار

(۱) مقدمہ ابن خلدون الجزء الاول مکتبہ التجاریۃ الکبریٰ قاہرہ، ص: ۵۷۲-۵۷۰

Marfat.com

(بڑھاپا تو دراصل جوانی کا پھول ہے پھر اسے چھپنے اور پوشیدہ رہنے کی کیا ضرورت ہے؟
چمن کا حسن تو کلیوں اور پھولوں کے دم سے ہے)

گویا معری کو بڑھاپا پھولوں کی طرح عزیز ہے، جس سے گلشن میں خوش بو پھوٹتی ہے۔

فرزدق کہتا ہے:

تفاريق شيب في الشباب لوامع و ما حسن ليل ليس فيه نجوم؟

(بڑھاپے کی مانگیں سفیدی سے چمک رہی ہیں، بھلا اس رات میں کیا حسن ہے جس میں
ستارے نہ نکلتے ہوں؟)

لیکن شریف رضی کہتا ہے:

غالطوني عن المشيب و قالوا لا ترع إنه جلاء حسام
قلت ما أمن من على الراس منه صارم الحد في يد الايام

(لوگوں نے مجھے بڑھاپے کے سلسلے میں غلط فہمی میں رکھنے کی کوشش کی، کہنے لگے
گھبرانے کی بات نہیں ہے یہ تو موت کے لیے آسانی فراہم کردی گئی میں نے کہا بھلا اس
شخص کی بے خوفی اور اطمینان کا کیا حال ہوگا جس کے سر پر تیز تلوار لٹک رہی ہو؟)

اسی طرح سیرت نگاروں کو دیکھیے ان کے طریقہ ادا، اسلوب اظہار اور انداز سیرت نگاری میں کتنا فرق ہے مثال کے طور پر سر سید احمد خان کی خطبات احمدیہ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نبی رحمت، علامہ شبلی نعمانی کی سیرت النبی اور نعیم صدیقی کی محسن انسانیت کو دیکھ جایئے۔ یا عربی میں ڈاکٹر محمد حسین ہیکل کی کتاب "حیات محمدؐ"، توفیق الحکیم کی محمدؐ، اور طٰہٰ حسین کی علیٰ هامش السيرة پڑھ لیجیے ہر ایک کے یہاں منفرد رنگ، اچھوتا انداز اور جداگانہ اسلوب ہے اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ اسلوب دراصل طریقۂ فکر، طریقۂ تصویر اور طریقۂ تعبیر کا نام ہے تو غلط نہ ہوگا۔(۱) امر واقعہ یہ ہے کہ اسلوب کی یہ آخری تعریف تمام عناصر اسلوب کو حاوی ہے گرچہ تفکیر و تصویر کا مظہر لفظی عنصر ہی ہے۔

---

(۱) الاسلوب دراسة بلاغة تحليلية لأصول الأساليب الأدبية، احمد الشائب، مكتبة النهضه المصرية، الطبعة الرابعة، ص: ۴۶

Marfat.com

اسلوب کی لازمی خصوصیات:

اسلوب کی متعدد خصوصیات ہو سکتی ہیں، جن کی معرفت معمولی غور و فکر سے حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن یہاں ان خصوصیات کا تذکرہ مقصود ہے جو سب پر عام، ہمہ گیر، دور رس اور مستحکم ہیں، جن کا تعلق تمام اسالیب سے ہے اور جو خود ادیب و مصنف کی شخصیت، اس کے جذبات و احساسات، ذوق و وجدان اور اس کے کلمات و عبارات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ان تمام خصوصیات کو ایک جملے میں بیان کرنا چاہیں تو اسے صدق تعبیر سے تعبیر کر سکتے ہیں اس لیے کہ ذہن و دماغ میں جو واضح فکر اور سچا جذبہ موجیں مار رہا ہے، اس کی تعبیر و تشریح میں اخلاص ہی وہ جوہر ہے جو اسلوب کو مثالی بنا دیتا ہے۔ مقصد و مدعا کے اعتبار سے خصوصیات کو تین خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ وضاحت اسلوب

۲۔ قوت تاثیر

۳۔ جمال و رعنائی

یہاں ہر خصوصیت پر قدرے تفصیل سے گفتگو کرنا مقصود ہے۔

وضاحت:

ادیب و مصنف کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مفہوم بالکل واضح، مدعا دو ٹوک اور مقصد عیاں ہو تاکہ قارئین اس کی تحریروں سے مستفید ہو سکیں اور ان کا علمی و ثقافتی معیار بلند ہو سکے۔ لہٰذا اس کا فرض ہے کہ اس زبان میں اپنی بات کہے جسے مخاطب سمجھتے ہوں (۱) اور تکلف و تصنع سے اجتناب کرے۔ اس ضمن میں اسے مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے:

۱- وضاحت فکر:

فکر خواص و عوام سب پر واضح ہو، جو بات کہنی ہے، اس میں کوئی جھول نہ ہو۔ تعقید اور

(۱) البیان والتبیین، الجاحظ جلد اول، ص:۱۰۵

Marfat.com

ابہام سے وہ پاک ہو۔

جیسے طغرائی کہتا ہے:

و من یستعن بالصبر نال مراده ولو بعد حین أنه خیر مسعدِ

(اور جس نے صبر سے مدد حاصل کی وہ اپنے مراد میں کامیاب ہو گیا، چاہے اس میں ایک مدت لگے۔ بلاشبہ وہ بہت خوش بخت اور نصیب والا ہے)

یا جیسے ابو تمام کہتا ہے:

و إذا امرءٌ مدح امرأ لنواله و أطال فیه فقد اراد هجاءهٗ

و لو لم یقدر فیه بعد المستقیٰ عند الورود لما أطال رشاءهٗ

(اور جب کوئی آدمی کسی بڑے آدمی کی بخشش کے لیے اس کی مدح کرتا ہے اور خوب مدح کرتا ہے تو اس سے اس کی ہجو ہونے لگتی ہے۔ اگر اس نے کنویں کی مسافت کی تعیین نہ کی تو رسی لمبی نہیں کر سکتا)

فکر کی یہ وضاحت و مہارت اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ درج ذیل چیزیں اختیار کی جائیں:

(الف) متعین کلمات کا انتخاب کیا جائے، ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں، جن میں معانی کا اشتراک پایا جاتا ہو۔ بلکہ وہی الفاظ منتخب کیے جائیں جو مفہوم کو پوری طرح ادا کرتے ہوں اس لیے مترادفات میں جو باریک فرق ہوتا ہے اسے ملحوظ رکھنا ہو گا۔

(ب) بہتر ہو گا کہ ادیب تشریح و تقیید اور تخییل و توصیف کے عناصر کا استعمال کرے تاکہ معانی واضح اور متعین ہو سکیں، جیسے مضاف الیہ، حال، تمیز اور استثناء وغیرہ کا استعمال ہونا چاہیے۔

جیسے ابن الرومی کہتا ہے:

کان مواهبه فی المحول آراؤه عند ضیق الحیل

فلو کان غیثا لعم البلاد و لو کان سیفًا لکان الاجل

و لو کان یعطی علی قدره لأغنی النفوس و أفنی الامل

(گویا اس کی صلاحیتیں ناکامی میں نکھرتی ہیں اور اس کی رائیں اس وقت کام آتی ہیں جب تدبیروں کا دامن تنگ ہو جاتا ہے اگر وہ بارش کرتا تو تمام ملکوں میں سیرابی کرتا اور اگر وہ تلوار ہوتا تو پیغام اجل ہوتا اور اگر اس کے فیصلے کے مطابق بخشش اور داد و دہش کا سلسلہ

Marfat.com

جاری کیا جائے تو لوگ مالدار ہو جائیں اور امیدیں ختم ہو جائیں)

(ج) اضداد کا استعمال ہونا چاہیے کہ اس سے معانی پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں لیکن اس میں احتیاط اور اعتدال شرط ہے۔ ورنہ مبالغہ اور غلو سے اسلوب میں خرابی پیدا ہو سکتی ہے جیسے بُحتری کہتا ہے:

متی ارت الدنیا بناهة خاملٍ   فلا ترقب إلا خمول بنیهٖ

(اگر دنیا نے گمنام شخص کو شہرت عطا کر دی ہے تو مشہور آدمی کی گمنامی کا اب انتظار کرو)

(د) غریب اور نامانوس الفاظ سے پرہیز کیا جائے اور وہی زبان استعمال کی جائے جسے لوگ سمجھ سکیں ورنہ مقصد فوت ہو جاتا ہے اور سامعین و قارئین استفادہ سے محروم رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیے:

حلال للیلیٰ أن تروع فؤاده   بهجر و مغفور للیلی ذنوبها

تطلع من نفسی للیلیٰ نوازع   عوارف أن الیاس منها نصیبها

وزالت زوال الشمس عن مستقرها   فمن مخبری فی ایّ أرض غروبها

(لیلیٰ کے لیے جائز ہے کہ اس کے دل کو جدائی سے خوف زدہ کردے کہ لیلیٰ کے جرائم قابل عفو ہیں۔ میرے نفس کے محرکات و جذبات نے اندر ہی کہا کہ مایوسی لیلیٰ کا مقدر ہو چکی ہے۔
وہ اپنے مستقر سے سورج کی طرح ڈھل گئی لیکن مجھے کون بتائے کہ وہ کس سرزمین میں غروب ہوئی ہے؟)

(ہ) پھر ان علمی، فنی، اجتماعی اور تاریخی اصطلاحات کا استعمال ہو جو متعین اور خاص معانی کے لیے تشکیل دی گئی ہیں تاکہ مصنف اور قارئین کے درمیان واضح علامات اور مشترک عقلی روابط موجود رہیں لیکن یہاں اس بات کا خیال رہے کہ خشک و بے جان، تجارتی و قانونی رنگ نہ چڑھنے پائے جو روح و وجدان سے یکسر خالی ہو۔

۲- وضاحت ترکیب:

فکر کی وضاحت کے بعد دوسری بات جو ضروری ہے، وہ ترکیب کی وضاحت ہے یعنی وہی ترکیب اور جملے استعمال ہوں جو واضح اور اپنے مفہوم میں صریح ہوں۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل خصوصیات درکار ہیں:

Marfat.com

(الف) مصنف اور ادیب کے اندر نحوی ذوق کی ضرورت ہے تاکہ کلمات کی ترتیب بہتر ڈھنگ سے کر سکے اور لبس اور غموض کی خرابیوں سے بچ سکے۔

(ب) اس بات پر مصنف کو غایت درجہ اطمینان ہو کہ کلام کے عناصر ترکیبی ایک ماہرانہ نظام اور مرتب تنظیم میں جڑے ہوئے ہیں جس سے قارئین کو مختلف اجزاء کے باہمی تعلقات ڈھونڈھنے میں پریشانی نہ ہو اور بے فائدہ محنت و مشقت نہ کرنی پڑے۔

(ج) پھر جملوں کی رعایت، فصل و وصل کا خیال اور حروف علت وغیرہ کے انتخاب پر بھی نظر رہنی چاہیے مثال کے طور پر شریف رضی کے یہ اشعار دیکھیے:

و لقد وقفت علی ربوعهم و طلولها بید البلی نهبٌ
فبکیتُ حتّی ضجّ من لغب نضور و لجّ بعذلی الرکب
و تلفتت عینی فمذ خفیت عنّی الطلول تلفت القلب

(میں ان کی قیام گاہوں پر ٹھہرا اور حال یہ تھا کہ ان کے کھنڈرات فنا کے ہاتھوں لوٹ کا سامان بن گئے تھے۔

میں رو پڑا یہاں تک کہ شور و غوغا بلند ہوا اور قافلے نے مجھے تنہا چھوڑ دینے پر اصرار کیا۔

اور میری آنکھ نے دیکھا اور جب کھنڈرات نظروں سے اوجھل ہو گئے تو قلب نے توجہ کی۔)

یہاں پہلے مصرع میں واؤ حالیہ پھر دوسرے شعر میں فاء کا استعمال اور حتی کا موقع پھر مُذ کا محل اور تلفت القلب کا جملہ ہر ایک کس طرح انگشتری میں نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے۔

قوت تاثیر:

قوت تاثیر دراصل وہ نفسی و باطنی طاقت ہے، جو سب سے پہلے خود اس ادیب سے پیدا ہوتی ہے، جو دوسروں کے اندر تاثر اور انفعال دیکھنا چاہتا ہے۔ دوسروں کو متاثر کرنے سے پہلے خود اسے متاثر ہونا چاہیے دوسروں کے اندر احساس و شعور بیدار کرنے سے پہلے خود اسی کے اندر اس احساس و شعور کی بیداری ضروری ہے۔ یہ دراصل اسلوب کی صفت سے پہلے جذبات، ارادہ اور اخلاق کی صفت ہے جو مصنف حقائق پر گہری نظر رکھتا ہو گا، پیش کردہ احکام پر مستحکم اعتقاد رکھتا ہو گا اور ان کی نشر و اشاعت اور تبلیغ و تلقین سے اسے دلچسپی ہو گی اس کی جھلک اس کی تحریروں میں بھی

Marfat.com

نظر آئے گی اور اس کے جذبات واحساسات کی گرمی اور تپش اس کے کلام میں بھی محسوس کی جاسکے گی اس مقصد کے لیے دو طریقے اختیار کیے جائیں گے!

قوت تصویر:

اس سے مراد وہ منظر نگاری ہے جو عقل سے آگے بڑھ کر جذبات واحساسات پر کمند ڈال دے۔ لفظی وحرفی مفہوم سے مجازی واستعاراتی باتوں کی طرف ذہن کو منتقل کردے اور یہ تمثیل و تشبیہ، استعارہ وکنایہ وغیرہ، بلاغت کے اصولوں کے ذریعے ممکن ہے، جس سے مخاطب کے سامنے فکر و نظر اور خیال و تدبر کی راہیں کھل جاتی ہیں مثال کے طور پر بشار بن برد کہتا ہے:

إذا أنت لم تشرب مراراً على القذى ظمئت وأى الناس تصفو مشاربهٗ

(اگر تم نے گندہ پانی بار بار نہیں پیا ہے تو تم پیاسے ہی رہے بھلا کون شخص ہے جس کے گھاٹ ہمیشہ صاف اور پاکیزہ ہوں؟)

اس شعر سے تین مطلب مراد لیے جاسکتے ہیں۔ پہلا مطلب جو ظاہری اور لفظی ہے، یہ کہ انسان کو بسا اوقات گندا پانی بھی پینا پڑتا ہے، اس لیے کہ ہمیشہ پانی کے صاف و شیریں رہنے کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد دوست کو لیا جائے جس کے اندر کوئی نہ کوئی عیب ضرور رہتا ہے کیوں کہ کوئی انسان عیب سے محفوظ نہیں ہے اور یہی مفہوم زیادہ مناسب ہے۔ کیوں کہ بشار کو ہمیشہ لعنت ملامت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ تیسرا مطلب یہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ زندگی میں زوال وناکامی کا احتمال باقی رہتا ہے۔ کیوں کہ مطلق کامیابی غیر یقینی ہوتی ہے۔

یہاں بعض ان وسائل کا ذکر کیا جاتا ہے، جس سے قوت تصویر پیدا ہو سکتی ہے:

(الف) مانوس و مالوف الفاظ برتے جائیں، متعین اور مشخص کلمات جو پیش نظر معانی کے لیے مخصوص ہوں، استعمال کیے جائیں، مشترک مبہم اور اجنبی الفاظ نہ استعمال کیے جائیں۔

(ب) وصفی کلمات کے استعمال سے قوت تاثیر اور قوت جمال دونوں پیدا ہوتی ہے۔ اس سے صحیح منظر نگاری اور واقعہ کی حقیقی عکاسی ہوتی ہے اور سچی تصویر کشی کے ذریعہ فعل وانفعال اور تاثیر و تاثر کا زور بڑھ جاتا ہے۔

(ج) کلمات کا مجازی استعمال یا ان کی نادر و غریب صفات اس سلسلے میں کافی مفید ہو سکتی ہیں۔

Marfat.com

(د) ضعیف کلمات، زائد الفاظ اور ثانوی عناصر عبارت سے پرہیز کیا جائے اور ارکان کلام پر اکتفا کیا جائے۔

قوت ترکیب:

متکلم اپنی آواز کے زیر و بم اور تکرار و اعادہ کے ذریعے اپنی بات کو موثر بنا سکتا ہے۔ لیکن تحریر میں آواز کا در و بست کام نہیں آئے گی اس لیے صوتی وسیلے کے علاوہ کچھ اور وسائل یہاں اختیار کرنے ہوں گے۔

(الف) قصر و تفخیم، اہمیت و افادیت، تاکید و تنظیم کے لیے تقدیم و تاخیر کے قواعد اختیار کیے جائیں۔

(ب) طباق بدیع کا استعمال بھی موثر اور مفید ثابت ہوتا ہے۔

(ج) چوں کہ بیشتر اوقات قوت تاثیر کا تقاضا، سرعت ہوتا ہے، اس لیے عام طور پر یہاں ایجاز کا اسلوب کارگر ثابت ہوتا ہے۔

جمال و رعنائی:

اگر ادیب اور مصنف مخاطب کے ذوق کا احترام کرنا چاہتے ہوں اور ان کی دل چسپی کو مد نظر رکھتے ہوں، تو ان کے لیے جمال و رعنائی کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ بسا اوقات عبارت ادب کا شاہکار ہوتی ہے۔ فکر واضح کی علمبردار ہوتی ہے، جذبات کو انگیخت کرنے والی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود ذوق کے لیے گراں بار ہوتی ہے اور مخاطب کے مزاج اور ذوق سے میل نہیں کھاتی۔ یہ نقص اکثر تعبیر کی کمزوری سے پیدا ہوتا ہے۔ اور شعور اور ادبی ذوق سے محرومی کا پتا دیتا ہے۔

یہ بات یہاں ذہن میں رہنی چاہیے کہ جمال کا مطلب صنائع و بدائع اور خیالی تصاویر کا استعمال نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک نفسی صفت ہے جو ادیب کے خیال اور اس کے مذاق سے جنم لیتی ہے خیال معانی کی گہرائی و گیرائی اور اس کے خوب صورت اسرار و رموز کا ادراک کرتا ہے اور ذوق اس خوب صورت خیال کے مناسب حال بہترین اور موزوں ترین عبارت کا انتخاب کرتا ہے۔ ذوق سے ہماری مراد وہ "مہذب ذوق" ہے، جس کو ادب نے صیقل کیا ہو، روایت نے اسے تابندگی

Marfat.com

بخشی ہو، ذکاوت نے اسے نکھارا ہو اسے کھرے کھوٹے میں تفریق کا ملکہ ہو اور حسین و قبیح کے درمیان تمیز اس پر آسان ہو(۱) اس طرح اسلوب کی یہ فنی صفت پیدا ہوتی ہے۔

جمال سلبی صفت بھی ہے اور ایجابی بھی۔ یہ تنافر اور وحشت سے اجتناب کا ثمرہ ہے اور ذوق وخیال کے جمال کی بازگشت ہے۔

سلبی گوشہ:

سلبی گوشہ سے ہماری مراد یہ ہے کہ عبارت صوتی اضطراب کے اسباب اور درشت و تند لہجے کے سرمایے سے خالی ہو۔ اس صورت میں عبارت متحد اور ہم آہنگ ہو سکتی ہے۔ حروف و کلمات میں نظم و نسق پیدا ہو سکتا ہے اور بآواز بلند پڑھنے سے اس میں نغمگی اور صوتی مٹھاس محسوس ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل باتیں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں:

(الف) مصنف اپنے بلند و پاکیزہ ذوق کے ذریعے تنافر حروف سے اجتناب پر قادر ہو۔ درج ذیل نمونے دیکھیے تنافر کلمات کی بہترین مثال ہیں۔ بحتری کہتا ہے:

حلفت لها باللّه يوم التفرق و بالوجد من قلبی بها المتعلق

(میں نے یوم انتشار کو اس سے خدا کی قسم کھائی اور اس سوزش کی بھی جو اس پر عاشق دل کے اندر موجود تھی)

یہاں قلبی موصوف اور المتعلق صفت کے درمیان بھا کے ذریعہ جو فصل پیدا ہو گیا ہے اس نے شعر کا جمال غائب کر دیا ہے۔ شاجم کے یہ اشعار دیکھیے:

والزهر والقطر فی رباها ما بين نظم و بين نثر
حدائق كف كلّ ريح حل بها خيط كل قصر

(اس کی پہاڑیوں پر پھول بھی ہیں اور بارش بھی، منظم بھی اور منتشر بھی ہر ہوا کی ہتھیلی کے باغات ہیں اور ہر محل کے نقش و نگار وہاں موجود ہیں)

یہاں پیہم اضافتوں نے اسلوب کی خوبصورتی چھین لی ہے۔ درج ذیل شعر پڑھیے:

ملكت مطال مولود مفدی مليح مانع منی مرادی

---

(۱) الوساطۃ، ص:۳۰

Marfat.com

(میں ایسے نوزائیدہ بچے کا مالک ہوا جس پر قربان ہوا جائے، بہت ہی خوب صورت اور
میری مرادوں میں رکاوٹ ہے)

اس شعر میں تمام الفاظ کے آغاز میں میم کی تکرار نے نغمگی کو مجروح کر دیا ہے۔

(ب) اسلوب کی عام نغمگی کا خیال رکھنا ضروری ہے اور آواز کی ہم آہنگی اور ترتیب دھیان میں رہنی چاہیے۔ اس سلسلے میں ضروری ہے کہ طویل کلمات سے اجتناب کیا جائے اور لمبے چوڑے مشابہ جملے اور عام عبارتیں نہ استعمال کی جائیں۔

ایجابی گوشہ:

اوپر جو کچھ سلبی گوشے کے سلسلے میں عرض کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ ایجابی عنصر کو رواج ملے اور جمال کے مثبت عناصر جگہ پا سکیں یعنی الفاظ و معانی میں تناسب و ہم آہنگی ہو اس تناسب و تناسق کے چند مظاہر یہ ہیں:

(الف) الفاظ و معانی میں طبعی و فطری مناسبت ہو تاکہ الفاظ صحیح معنوں میں معانی کی حکایت بن سکیں۔

(ب) اِس کے لیے لازم ہے کہ مصنف کے اندر صادق شعور اور خیال بلند موجود ہو۔

(ج) اس صورت میں عبارتوں کی ترتیب و تشکیل اس معنوی نمونہ کے مطابق ہو گی جو ادیب کے دل میں موجود ہے۔

یہ ہیں اسلوب کی خصوصیات اور تفصیلات جو ماہرین اسالیب نے اپنی کتابوں میں جمع کر دی ہیں۔(۱)

اسلوب کی تعریف اور اس کی خصوصیات پر اس مختصر گفتگو سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اس کی کیا افادیت و اہمیت ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی زبان کی تفہیم میں اس کے اسلوب کے فہم کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ اس کو سمجھے بغیر ہم اس زبان کی نزاکتوں اور باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ اسی کو علماے بلاغت نے علم معانی کا نام دیا ہے۔ ہر کلام متکلم کے جذبات کا آئینہ دار اور اس کی شخصیت کا بھرپور عکاس ہوتا ہے۔ مصنف کے رنج و الم، فرحت و مسرت، غضب و ناراضی، امید و ناامیدی، حسرت و مایوسی، نرمی و شدت اور دوسرے تمام جذبات کا پتا اس کی

(۱) یہ تفصیلات احمد الشائب کی کتاب الاسلوب سے ملخص ہیں۔

Marfat.com

تحریروں سے چل جاتا ہے اور یہ سارے نکتے اس کے اسلوب کو سمجھے بغیر حل نہیں ہو سکتے۔

لیکن ہر زبان کے اسلوب مختلف ہوتے ہیں، ہر قوم کے عقلی و فکری معیار میں تفاوت ہوتا ہے۔ اس لیے اس میدان میں مجرد رائے اور تخمین سے کام نہیں چل سکتا بلکہ ہر زبان کے بولنے والوں کی عادات و خصائل، اسالیب و اطوار سے واقفیت ناگزیر ہے اِس کے بغیر کسی زبان کے فہم کا دعوی کرنا بے کار ہے۔

موضوع پر اسلاف کی خدمات :

اس موضوع پر ماضی میں علمائے تفسیر و بلاغت نے بڑے قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں یہاں تک کہ انھوں نے اس میدان میں دوسری اقوام کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ مثال کے طور پر عبدالقاہر جرجانی کی کتاب دلائل الاعجاز اس موضوع پر قابل فخر کارنامہ ہے۔

قرآن کی عظمت و جلالت اس میں نہیں ہے کہ نحو و بلاغت کے مروجہ اصولوں پر قرآن کے ادب کو پرکھا جائے کیوں کہ اس سے قرآن کی بہت سی چیزیں متاثر ہوں گی۔ پھر بہت سے الفاظ زائد ماننے پڑیں گے، نحو کے بہت سے اصولوں سے انحراف لازم آئے گا اور بلاغت کے بہت سے نکتے قرآن کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ادب و بلاغت کی دنیا میں اجتہاد سے کام لیا جائے اور تقلید کے راستہ کو چھوڑ کر بلاغت کے نئے اصول وضع کیے جائیں جن کی بنیاد قرآن کا بے مثل اور لازوال ادب ہو اور تائید میں امرؤالقیس اور عمرو بن کلثوم اور قس بن ساعدہ کی ٹکسالی عربی زبان ہو۔ اگر اس طرز پر کام کیا جائے تو بلاغت کی دنیا میں ایک انقلاب آئے گا اور بہت سے پرانے اصول اپنی جگہ چھوڑنے پر مجبور ہوں گے اور حریری و متنبّی کی جگہ دور جاہلیت کا شہ پارہ بنیاد کا کام دے گا اور قرآن کا الہامی ادب اور زیادہ نکھر کر قارئین کے سامنے آسکے گا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ادب اور دین کا تعلق چولی دامن کا ہے۔ ہر نبی نے دعوت فصیح و بلیغ زبان میں دی ہے اور ادب کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھتے ہوئے اس نے اپنی دعوت عوام تک پہونچائی ہے اور اس خاص صفت کی کمی پر اس نے اپنے رب سے بطور خاص دعا فرمائی ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز ہی یہ تھا کہ آپ کو جو معجزہ عطا کیا گیا وہ یہی قرآن کا ادب تھا جس نے منکرین حق کو بار بار چیلنج کیا لیکن آج تک کسی نے اس کا جواب نہ دیا۔ دوسری طرف آپ کا امتیاز یہ

Marfat.com

بھی تھا کہ آپ جوامع الکلم سے نوازے گئے تھے۔

قرآن کا اعجاز دراصل اس کے نظم وترتیب میں پوشیدہ ہے پورا قرآن ایک منظم ومرتب کتاب ہے۔ تفسیر قرآن کی تاریخ بتاتی ہے کہ مفسرین وعلماء کا ایک طبقہ اگر نظم کا مخالف رہا ہے تو بہت بڑا طبقہ اس کا حامی رہا ہے اور اس نے اپنی حد تک قرآن میں نظم تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

قرآن کے اسی نظم وترتیب سے وہ اسلوب وجود میں آتا ہے جو اپنی نوعیت کا منفرد اور یکتا اسلوب ہے۔

ابتداء میں اسلوب کی جو تعریف کی گئی ہے اور اس کی جو خصوصیات ماہرین بلاغت نے بتائی ہیں، انھیں آپ قرآن پر منطبق کر کے دیکھیں تو قرآن کا اعجاز اور زیادہ استحکام کے ساتھ آپ کے سامنے چیلنج بن کر نمودار ہوگا۔

قرآن پاک کی روشنی میں اور جاہلی کلام کی تائید سے انیس اسالیب اس کتاب میں منتخب کیے گئے ہیں، جو یہاں آپ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں۔ اگر موقع ملا اور اللہ نے توفیق دی تو اس موضوع پر مزید کام کرنے کا ارادہ اور حوصلہ رکھتا ہوں اس لیے کہ زندگی کا حاصل یہی ہے کہ وہ قرآن کی خدمت میں صرف ہو جائے۔

عبیداللہ فہد فلاحی

ریڈر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی
علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

Marfat.com

اسلوب قرآن اور اس کی خصوصیات

اعجاز کلام کے لیے جس طرح رعنائیِ خیال اور بلندیِ مضمون ضروری ہے، اسی طرح دل کش اور موثر اسلوب اور حسین و جمیل طرز بیان بھی لازمی ہے، بلکہ بسا اوقات بلند اور نادر مضامین بھی بھونڈے اور فرسودہ پیرایۂ بیان کی وجہ سے اپنی تاثیر کھو دیتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض پامال اور معمولی باتیں بھی اپنی جادو بیانی اور جدّتِ ادا کی وجہ سے معجز نما بن جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا حمید الدین فراہیؒ کلام کے معجزہ ہونے کے لیے اس میں ہدایت و حکمت کے ساتھ کمال بلاغت، حسن الفاظ اور موثر فصاحت کو ضروری قرار دیتے ہیں (۱) قرآن پاک جو عربی ادب کا بے بدل اور لازوال نمونہ ہے، اس کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ بلند معانی اور الہامی تعلیمات کے ساتھ اس نے وہ اسلوب بیان اختیار کیا جس کی نظیر پیش کرنے سے اہل عرب عاجز رہ گئے۔

قرآن سے پہلے عربوں کے یہاں یا تو شعر تھا یا پھر نثر میں کاہنوں کے اقوال تھے، جن میں لفظی صناعی نمایاں ہوتی تھی۔ اثر یا تو شعر کا مسلم تھا یا جادو کا، معانی کے لحاظ سے کاہنوں کے اقوال بالکل ہی کھوکھلے اور اشعار تدبر سے عاری ہوتے تھے۔ جب قرآن سامنے آیا، تو سب حیران رہ گئے کہ اس کو کس صنف میں داخل کیا جائے، ناقابل انکار تاثیر کا خیال کرتے تو اس کو شعر (۲) یا سحر (۳) کے خانے میں رکھ دیتے، حالاں کہ قرآن کا شعر یا سحر نہ ہونا ایک بدیہی بات تھی۔ نثر کی ظاہری شکل پر نظر جاتی تو قول کاہن کے علاوہ اور کوئی دوسری صنف ہی نہ تھی، اگر کبھی معنی و مطلب کی طرف نظر گئی تو انہیں قرآن میں "اساطیر الاولین" کے سوا اور کچھ لحاظ کے قابل نہ ملا۔ دراصل قرآن کی بلندی یہ تھی کہ اس نے پہلی مرتبہ انسان کو غور و فکر پر آمادہ کیا اور اپنی اور کائنات کی حقیقت معلوم کرنے پر ابھارا، پھر اس نے اپنی بات کو پیش کرنے کے لیے جو وسیلہ اختیار کیا، اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں نہ تو بحر ہے نہ وزن اور نہ قوافی کا التزام۔ وہ سجع کے اس بوجھ سے بھی آزاد ہے، جو کاہنوں کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے سادہ اسلوب میں دل میں اتر جانے والی تاثیر رکھتا ہے۔ قرآن کا قالب نثری ہے جو چھوٹے چھوٹے جملوں پر مشتمل ہے۔ ایسے جملے کہ ان کو ملا کر پڑھتے وقت وہ نغمہ اور صوت کے لحاظ سے ایک دوسرے کی نظیر معلوم ہوتے ہیں۔ اس نے نظم و

Marfat.com

ترتیب اور اجمال و تفصیل کا وہ بہترین نمونہ پیش کیا کہ اہل عرب دنگ رہ گئے۔(۴)

دور جدید کے مفسر سید قطب شہیدؒ قرآن کے اعجاز پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قرآن کی جادوگری شریعت کے قوانین، غیب کی خبروں اور علوم کائنات سے ہٹ کر خود اس کی ترتیب و مناسبت اور نظم میں ہے، نہ کہ صرف زیر بحث موضوع میں، یہ الگ بات ہے کہ خود عقیدۂ اسلامی کی طبیعت میں قوت اور جاذبیت موجود ہے۔"(۵)

علامہ عبدالکریم الخطیب بھی اعجاز قرآن کو اس کے اسالیب کے اندر محصور مانتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ جو شخص بھی عربی زبان کا سمجھنے والا ہوگا، کلام کی خوب صورتی اور اس کی رعنائی سے واقفیت رکھتا ہوگا وہ قرآن پاک کے معجز نما کلام اور اس کی آیات کی اثر انگیزی کو بخوبی محسوس کرے گا۔(۶)

علامہ مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی نے وجوہ اعجاز کے سلسلے میں ایک قول نقل کیا ہے، جس سے ہماری بات کی بخوبی تائید ہوتی ہے وہ یہ:

إنما عجزوا عن نظم مثل نظمه فإن أنواع كلامهم كانت منحصرة فى الأسجاع والأشعار والأراجيز فجاء نظم التنزيل على أسلوب بديع لا يشبه شيئا من تلك الأنواع فقصرت أيدى بلاغتهم عن بلوغ أدنى رتبة من مراتب نظمه۔ (۷)

"اہل عرب قرآن جیسا نظم و ترتیب پیش کرنے سے عاجز رہ گئے، ان کا ادبی ذخیرہ کلام کی تین قسموں تک محدود تھا، مسجع عبارات، اشعار اور رجزیہ قصائد، لیکن قرآن نے نظم و ترتیب کا ایسا منفرد اسلوب پیش کیا جو ان انواع سے ذرا بھی مشابہت نہ رکھتا تھا، چناں چہ ماہرینِ بلاغت قرآن کے ادنی ترین درجہ نظم تک پہونچنے سے قاصر رہ گئے۔"

خلیفہ عباسی متوکل کا ہم عصر علی بن ربن طبری بھی اسلوب قرآن کو اس کا معجزہ قرار دیتا تھا، اس نے اپنے یہ خیالات اپنی کتاب "الدین والدولة" کے صفحہ ۴۰ پر تحریر کیے ہیں وہ کہتا ہے:

"جب میں مسیحی تھا تو اپنے چچا کی طرح میں بھی اس بات کا دعویدار تھا کہ قرآن کا اسلوب معجزہ نہیں ہے، نہ یہ نبوت کی علامتوں میں سے ہے بلکہ یہ تمام انسانوں کے بس میں ہے، لیکن جب میں نے اس کی تقلید کی کوشش کی اور اس کے کلمات کے مفہوم سے آشنا ہوا تو اس وقت مجھے پتا چلا کہ قرآن کے پیروکار صحیح دعویٰ کرتے ہیں، اس لیے کہ

90687

Marfat.com

مجھے نہیں معلوم کہ کتاب اللہ یعنی قرآن جیسی کوئی کتاب ہو جو خیر کا حکم دیتی ہو، برائی سے روکتی ہو، شریعت الٰہی اور نبوت پر عقیدہ پیدا کرتی ہو، اور جنت کی خواہش اور جہنم کا خوف انسان کے اندر راسخ کر دیتی ہو۔ ہمارے پاس ایک شخص کتاب لاتا ہے، جو انہی خصوصیات کا حامل ہے جب کہ وہ شخص امی ہے، اس نے کبھی کتابت و بلاغت کے فن میں دلچسپی نہیں لی، تو یہ کتاب بلاشبہ اس کی نبوت کی ایک دلیل ہے۔"

اس طرح ابن ربن طبری کے نزدیک قرآن کا اصلاحی ہدف اور اس ہدف کی تحصیل، اس کے اوامر و نواہی اور جنت و جہنم کی خبریں، اور نبی کے امی ہونے کے باوجود اس کتاب کا دل کش و مؤثر اور دل میں اتر جانے والا اسلوب یہ سب معجزہ ہیں۔(۸)

علامہ محمد عبدالعظیم الزرقانی نے اسلوب قرآن کی مندرجہ ذیل خصوصیات بیان کی ہیں:

"۱۔ قرآن کا لفظی آہنگ جو اس کے صوتی نظام اور لغوی جمال سے مرکب ہے،

یہاں قرآن کے صوتی نظام سے مراد حرکات و سکنات، اتصال و انفصال اور غنائیت و نغمگی میں قرآن کا اتحاد اور اس کی موزونیت ہے۔ اور قرآن کے لغوی جمال سے مراد وہ نادر و عجیب مظہر ہے جس میں قرآن اپنے حروف اور کلمات کی ترتیب میں منفرد و ممتاز ہے اگر آپ قرآن کو اس طرح پڑھیں کہ اس کے حروف مخرج سے نکلیں اور ترتیل کا اہتمام رکھا جائے تو سننے والا ایک خاص قسم کی لذت اور فرحت محسوس کرتا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ اس صوتی نظام اور جمال لغوی کی وجہ سے ایک طرف قرآن کا اعجاز نمایاں ہوتا ہے تو دوسری طرف قرآن کو حفظ کرنے میں اس سے سہولت بھی ملتی ہے اور کانوں کو بھلا معلوم ہوتا اور زبان ادائیگی میں ایک نیا مزہ محسوس کرتی ہے۔

۲۔ اس کی دوسری خصوصیت یہ کہ یہ عوام و خواص دونوں کی تشفی کرتا ہے، دونوں ہی طبقے اس کے جلال کو محسوس کرتے ہیں، اس کی تلاوت کا مزہ چکھتے ہیں اور اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق اس سے اخذ کرتے ہیں جس سے ان کی عقلوں کو اطمینان اور جذبات کو تسکین ہوتی ہے۔

۳۔ یہ اسلوب بیک وقت عقل اور جذبہ دونوں کے لیے سامان رکھتا ہے، قرآن نے عقل اور قلب کو ایک ساتھ خطاب کیا اور حق اور جمال کو ایک ساتھ ملا دیا ہے۔

Marfat.com

۴۔ اس اسلوب کی چوتھی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک طرف احکام و قوانین کی تفصیلات بیان کرتا ہے اور دوسری طرف اپنے اجزاء، کلمات، جملوں اور آیات و سور کو باہم دگر اس طرح مربوط اور منظم کیے ہوئے ہے کہ کوئی دوسرا کلام اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔

۵۔ اس اسلوب کی پانچویں خصوصیت تصریف ہے، یعنی ایک ہی مضمون کو سو رنگ سے باندھا جاتا ہے اور ہر رنگ اپنی جگہ نادر اور بے مثال کشش رکھتا ہے، مفہوم ایک ہے لیکن الفاظ مختلف ہیں اور پیش و عقب اور لواحق و تضمنات میں فرق ہے اور ہر جگہ اِس کے اطراف و جوانب اور تعلقات و روابط بدلے ہوئے ہیں۔ تاکہ ذہن سلیم رکھنے والا شخص اس کو سمجھ ہی لے۔

۶۔ اس اسلوب نے اجمال اور تفصیل کو ایک ساتھ سمیٹ لیا ہے جب کہ کسی انسانی کلام میں یہ دونوں چیزیں اضداد میں شمار کی جاتی ہیں۔

۷۔ الفاظ بقدر ضرورت ہیں لیکن مفہوم مکمل ہے، قرآن نے انسانی ضرورت کے حساب سے الفاظ اور جملوں کا استعمال کیا ہے، ایسا نہیں ہے کہ مفہوم سے زائد لفظ کا استعمال ہو گیا ہو یا الفاظ اتنے کم ہوں کہ مخلوق کی ہدایت میں رکاوٹ بن جائیں، اس لفظی احتیاط اور اعتدال کے باوجود معنی بالکل واضح اور صاف ہے اس میں کوئی کمی نہیں ہے، نہ کوئی ابہام یا تعقید ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

كِتَابٌ أُحكِمَتْ آيَاتُهُ ثم فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيرٍ۔ (هود: ۱)

"فرمان ہے، جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوئی ہیں ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے"(۹)

معلوم ہوا کہ قرآن کی اصل عظمت اور بلندی اس کے منفرد اسلوب اور نادر طرز بیان میں ہے۔ ان اسالیب کا مطالعہ کیے بغیر ہم قرآن کی روح تک نہیں پہونچ سکتے، اس لیے قرآن کے بلند پایہ اور اعلیٰ مقام کو سمجھنے کے لیے اس کے اسالیب کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کتاب میں قرآن کے چند اسالیب سے مختصر بحث کی گئی ہے، تفصیل کے لیے خود قرآن پاک کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

Marfat.com

قرآن مبین کے بعض اسالیب

ا۔ عود علی البدء

یہ قرآن پاک کا ایک اہم اسلوب ہے، یعنی کلام کا آغاز جس چیز سے ہوا ہو اسی پر کلام کا خاتمہ بھی کرنا تاکہ اس مضمون کی اہمیت و افادیت دلوں پر نقش ہو جائے اور سامع اسے فراموش نہ کر سکے، بیچ میں کسی خاص مناسبت اور تقریب سے کچھ مزید چیزیں اور بحثیں بھی آجاتی ہیں جن پر بقدر ضرورت روشنی ڈال دی جاتی ہے، پھر اصل مقصود کی طرف رجوع کر کے پوری گفتگو سمیٹ دی جاتی ہے۔

سورۂ مومنون کی ابتدائی آیات میں مومنین کی صفات گنائی گئی ہیں اور ابتداء نماز سے کی گئی ہے۔ فرمایا گیا:

قَدۡ أَفۡلَحَ الۡمُومِنُونَ الَّذِينَ هُمۡ فِي صَلاَتِهِم خَاشِعُونَ۔ (مومنون: ۱-۲)

"یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں"

درمیان میں مختلف صفات کا تذکرہ کرنے کے بعد آخر میں پھر اسی صفت کا اعادہ کیا گیا:

وَالَّذِينَ هُم عَلَى صَلَوَاتِهِمۡ يُحَافِظُونَ (۹)

"اور جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔"

مقصد نماز کو نیکیوں کا منبع اور ان کی محافظ ثابت کرنا ہے، اس امر پر زور دینا ہے کہ نماز ہی سے نیکی کی شروعات ہوتی ہے اور نماز ہی سے ان کی حفاظت بھی ہوتی ہے، اسی مضمون کو حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث میں اس طرح زور دے کر فرمایا ہے:

لاَ خَيۡرَ فِيۡ دِيۡنٍ بِلاَ صَلوٰةٍ (۱۰)

یعنی جس دین میں نماز نہ ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کے تیسرے اور چوتھے رکوع کا مطالعہ کیجیے جن میں دین کی بنیادی اخلاقیات بیان ہوئی ہیں، ان میں والدین کے حقوق، رشتہ داروں اور مسکینوں کے حقوق، کنجوسی اور فضول خرچی سے اجتناب، قتل اولاد کی ممانعت، زنا، قتل، یتیموں کا مال کھانا، ناپ تول میں کمی کرنا،

Marfat.com

زمین میں تکبر اور اکڑفوں کی چال چلنا ان سب سے روکا گیا ہے، لیکن ان سارے امر و نواہی کی ابتدا توحید سے ہوئی ہے اور سب سے پہلے توحید پر زور دیا جاتا اور شرک سے روکا جاتا ہے۔

لاَ تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُومًا مَخْذُولاً (بنی اسرائیل:۲۲)

"تو اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنا ورنہ ملامت زدہ اور بے یار و مددگار بیٹھا رہ جائے گا"

اور اس اخلاقی درس کی انتہاء بھی شرک سے اجتناب کی اسی تعلیم پر ہوئی ہے، اس ٹکڑے کے آخر میں فرمایا جاتا ہے:

وَلاَ تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ فَتُلْقَى فِى جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَدْحُورًا۔

(بنی اسرائیل:۲۹)

"اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنا بیٹھ ورنہ تو جہنم میں ڈال دیا جائے گا، علامت زدہ اور راندہ ہو کر"۔

یہاں یہ حقیقت ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ ان تمام بھلائیوں سے وابستگی اور ان تمام حقوق کی ادائیگی توحید سے ممکن ہے، جو شخص توحید کی اس تعلیم پر قائم رہے گا وہی ان تمام حقوق کو ادا کر سکتا اور ان اخلاقیات کا پابند رہ سکتا ہے۔ اسی سے ان فضائل کی ابتداء اور اسی پر ان کی انتہا بھی ہوتی ہے۔

سورۂ ممتحنہ کی پہلی ہی آیت میں دشمنوں سے ترک موالات کا حکم دیا گیا ہے، فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لاَ تَتَّخِذُوا عَدُوِّىْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَاءَ تُلْقُوْنَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ و قد كَفَرُوا بِمَا جَاءَ كُمْ مِنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ إِيَّاكُم اَنْ تُوْمِنُوا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ إِنْ كُنْتُم خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِى سَبِيْلِى و ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِى۔ (ممتحنه : ۱)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور میری رضاجوئی کی خاطر (وطن چھوڑ کر گھروں سے) نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو، حالاں کہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس کے ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں۔ اور اُن کی روش یہ ہے کہ رسول کو خود تم کو صرف اس قصور پر جلاوطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب اللہ پر ایمان لائے ہو۔"

آخر میں اسی مضمون پر سورہ کا اختتام کیا گیا ہے، فرمایا:

Marfat.com

يا ايُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لاَ تَتَوَلَّوا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قد يَئِسُوا مِنَ الآخِرَةِ كما يَئِسَ الكُفَّارُ مِنْ أَصْحٰبِ القُبُور۔ (ممتحنه : ۱۳)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ جن پر اللہ نے غضب فرمایا ہے، جو آخرت سے اسی طرح مایوس ہیں جس طرح کفار قبر والوں سے"۔

گویا اس سورہ کا مرکزی مضمون دشمنوں سے ترک موالات ہے۔

اس اسلوب کی متعدد مثالیں سورۂ بقرہ میں بھی موجود ہیں، آیت ۴۰ میں بنی اسرائیل کو خدا کے احسانات جو ان پر کیے گئے ہیں، یاد دلائے گئے ہیں، پھر آگے آیت ۴۷ میں اسی مضمون کو دہرایا گیا ہے تاکہ ملامت کے انداز میں یہ دعوت کارگر ثابت ہو اور ان کا جمود ٹوٹ سکے۔

اسی طرح اس سورہ کی آیت ۱۵۲ میں نماز اور صبر سے مدد حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور پھر اس باب کا خاتمہ اسی حکم پر کیا گیا، اور فرمایا گیا:

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ والصَلَوةِ الوُسْطَى وَ قُومُوا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۔ فإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْرُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوْا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُون۔ (سورہ بقرہ: ۲۳۸-۲۳۹)

"اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو، خاص طور سے صلاۃ وسطی کی، اللہ کے آگے اسی طرح کھڑے ہو جس طرح فرمانبردار غلام کھڑے ہوتے ہیں، بدامنی کی حالت ہو تو خواہ پیدل ہو خواہ سوار جس طرح ممکن ہو نماز پڑھو اور جب امن میسر آجائے تو اللہ کو اس طریقے سے یاد کرو جو اس نے تمہیں سکھا دیا ہے جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔"

یہی اسلوب سورۂ معارج میں بھی موجود ہے، فرمایا جا رہا ہے کہ نفس کے متضاد داعیات میں صحیح توازن اور نقطۂ اعتدال پیدا کرنے میں اولین عامل نماز ہے۔ جو شخص اپنی تربیت اس طرز پر کرنا چاہے کہ شیطان اسے کسی بے راہ روی میں مبتلا نہ کرنے پائے، اس کے لیے سب سے اول شئ نماز کا اہتمام ہے، مختلف صفات کا تذکرہ کرنے کے بعد آخر میں پھر نماز کا ذکر فرمایا، وہ آیات یہ ہیں:

إِنَّ الإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا، إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا و إِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا إلا المُصَلِّيْنَ الذِيْنَ هُمْ عَلَى صَلاَتِهِم قَائِمُون۔ والذِيْنَ هُمْ فِى أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ لِلسَّائِلِ والمَحْرُوْم والذِيْنَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْم

Marfat.com

الدِّيْنُ، و الذين هُمْ مِنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُون إن عَذَابَ رَبِّهِم غَيْرُ مَامُون، والذِيْنَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حٰفِظُون، إلاَّ عَلَى ازْوَاجِهِمْ أو مَا مَلَكَتْ اَيمَانُهُم فإنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِيْنَ۔ فَمَنِ ابْتَغَى وَرَآءَ ذَلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْعَادُوْن، والذينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رَاعُونَ وَالَّذِيْنَ هُم بِشَهَادٰتِهِمْ قَائِمُون، والذِين هُمْ عَلَى صَلَاتِهِم يُحَافِظُون اُولٰئِكَ فِي جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ (معارج: ۱۹-۳۵)

"انسان بے صبر اپیدا کیا گیا ہے، جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ گھبرا جانے والا ہے، اور جب اس کو کشادگی حاصل ہوتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے صرف نمازی ہی اس سے مستثنیٰ ہیں وہ جو اپنی نمازوں کی مداومت رکھتے ہیں اور وہ جن کے مالوں میں ایک متعین حق ہوتا ہے سائلوں اور محروموں کا اور جو تصدیق کرتے ہیں جزا کے دن کی اور وہ جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے رہنے والے ہیں، بے شک ان کے رب کا عذاب بے خوف ہونے کی چیز نہیں ہے اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، بجز اپنی بیویوں اور لونڈیوں کی حد تک سو اس باب میں ان کو کوئی ملامت نہیں، ہاں جس نے اس سے آگے بڑھ کر چاہا تو وہی لوگ حدود سے تجاوز کرنے والے ہیں اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں اور وہ جو اپنی شہادتوں کو ادا کرنے والے ہیں اور وہ جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں، یہی لوگ جنتوں میں عزت کے ساتھ رہنے والے ہوں گے۔"

یہاں دیکھیے آیات ۲۲- ۲۳ میں نماز ہی سے ان صفات کے بیان کا آغاز ہوا تھا اور اب اسی پر اس بات کو ختم کیا ہے، جس سے یہ بات بالبداہت نکلتی ہے کہ تمام ہی نیکیوں کا منبع وہی ہے اور وہی ان کی محافظ بھی ہے۔

Marfat.com

۲- علی سبیل المشاکلہ

عربی ادب کا ایک عام اسلوب یہ ہے کہ کبھی کبھی بعض الفاظ محض مجانست اور صوتی ہم آہنگی کی وجہ سے استعمال ہو جاتے ہیں۔ان کا مفہوم ان کے لغوی معنی کے لحاظ سے نہیں بلکہ موقع و محل سے متعین ہوتا ہے، مثال کے طور پر حماسی شاعر کہتا ہے:

وَلَمْ يَبْقَ سِوَى العُدْوانِ دِنَّاهُمْ كَمَا دَانُوا

(اور ظلم کا بدلہ دینے کے سوا کوئی راہ باقی نہ رہی، ہم نے انہیں بدلہ دیا، جس طرح انھوں نے ہمارے ساتھ سلوک کیا)

یہاں "کما دَانُو" اپنے لغوی مفہوم (انھوں نے بدلہ دیا) میں نہیں بلکہ فَعَلُوا یاظَلَمُوا کے معنی میں مستعمل ہے، اس لیے کہ دشمن نے حملہ میں پہل کی تھی اور اس صورت میں دشمن کے لیے بدلہ دینے کا مفہوم بے معنی ہو جاتا ہے۔

یہ اسلوب قرآن پاک میں بہت مستعمل ہے، سورۂ ہود میں فرمایا:

قَالَ إن تسخَرُوا مِنَّا فَإنّا نَسْخَرُ مِنكُمْ كما تَسْخَرُونَ۔

(هود: ۳۸)

"نبی نے کہا: اگر تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو تو ہم بھی کل تم پر ہنسیں گے جس طرح تم آج ہنس رہے ہو۔"

یہاں یہ مراد نہیں ہے کہ ہم بھی اسی طرح تم پر پھبتیاں چست کریں گے جس طرح کہ تم پھبتیاں چست کر رہے ہو، کیوں کہ پھبتی چست کرنے اور مذاق اڑانے کی قرآن میں عام ممانعت کی گئی ہے (۱۱) اور نبی تو اس طرح کی سطحی حرکتوں سے بہت بلند ہوتا ہے، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آج جس طرح ہمارا یہ فعل تمہاری نگاہوں میں سامان مضحکہ ہے، اسی طرح کل تمہارا انجام ہمارے لیے موجب ازدیاد ایمان و اطمینان ہوگا، آج تم ہنس رہے ہو، کل تم روؤ گے اور ہم نصرت الٰہی کے ظہور پر مسرور ہوں گے اور اپنے رب کے شکر گذار ہوں گے۔

یہاں فإن نسخر منكم (ہم بھی کل تم پر ہنسیں گے) محض صوتی ہم آہنگی کے لیے اور

Marfat.com

برسبیل مشاکلت استعمال ہوا ہے ورنہ کسی کی مصیبت اور رسوائی پر ہنسنا لائق تحسین نہیں ہے۔

اِس اسلوب کی دوسری مثال سورۂ بقرہ میں ہے فرمایا:

فَاِنِ انْتَھَوا فَلاَ عُدْوَانَ اِلاَّ عَلَی الظَّالِمِیْنَ۔ (بقرہ: ۱۹۳)

"اگر وہ باز آجائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا کسی پر ظلم جائز نہیں ہے۔

یہاں لفظ عدوان ظلم وزیادتی کے معنی میں نہ استعمال ہو کر محض اس اقدام کے معنی میں آیا ہے جو جوابی کارروائی کے طور پر کیا جائے، مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اپنی حرکتوں سے باز آکر اسلام کی راہ اختیار لیں تو ان کے پچھلے جرائم کی بناء پر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہوگی، صرف انہی کے خلاف کوئی اقدام ہوگا جو اپنے کفروشرک اور ظلم وعدوان پر جمے رہیں۔

اسی سورہ میں آگے فرمایا:

فَمَنِ اعْتَدَیٰ عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَیٰ عَلَیْکُمْ .

(بقرہ: ۹۴)

"پس جو تم پر زیادتی کریں تم بھی ان کی زیادتی کے جواب میں اسی کے برابر ان کو جواب دو"

اس آیت میں کسی زیادتی کے جواب میں جو اقدام کیا جائے، اس کو بھی اعتداء کے لفظ سے تعبیر فرمایا حالاں کہ وہ محض اقدام اور جوابی کارروائی کے معنی میں ہے، صرف ماسبق کے ساتھ صوتی ہم آہنگی کی وجہ سے اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔

اس اسلوب کی چوتھی مثال سورۂ شوریٰ کی آیت ۴۰ ہے، فرمایا:

وَ جَزَاءُ سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِثْلُھَا فَمَنْ عَفَا وَ أَصْلَحَ فَأَجْرُہُ عَلَی اللّٰہِ، إِنَّہ لاَ یُحِبُّ الظَّالِمِیْنَ ۔ (شوری : ۴۰)

"برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے پھر جو کوئی معاف کردے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا"

یہاں کسی برائی کے جواب میں جو اقدام کیا جائے اسے بھی برائی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، حالاں کہ برائی کا جواب دینا اور انتقام لینا جائز ہے، بشرطیکہ حد سے تجاوز نہ ہو لیکن اسے بھی برائی کہنا محض لفظی مجانست اور صوتی ہم آہنگی کی وجہ سے ہے، یعنی اہل ایمان کسی برائی کے جواب میں اتنی ہی کارروائی کرتے ہیں جو برائی کے ہم وزن ہو، ایسا نہیں ہوتا کہ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیں۔

Marfat.com

اس طرح قرآن پاک میں مکر، استہزاء اور دوسری ناپسندیدہ صفات وافعال کا خدا کی طرف جو انتساب کیا گیا ہے وہ بھی اسی قبیل سے ہے، مثال کے طور پر "مَکْر" ہے، اگرچہ ایک گروہ نے اسے اچھے معنی میں بھی لیا ہے، اس کے بقول خفیہ تدبیر بعض حالات میں کسی مکر کرنے والے کے مکر کے توڑ یا اس کی سزا کے طور پر بھی استعمال کرنی پڑتی ہے۔ خفیہ چالیں چلنے والے کے خلاف اگر کوئی انتقامی کارروائی کی جائے تو وہ اس کو ظلم وزیادتی قرار دے گا اور حالات سے ناواقف اس کو حق بجانب ٹھہرائیں گے، اس طرح کوئی مخفی تدبیر کسی سازشی دشمن کے خلاف بعض اوقات اس کو متنبہ کرنے کے لیے اختیار کرنی پڑتی ہے تاکہ اس پر ظاہر ہو جائے کہ اس کی سازشیں مخفی نہیں ہیں جن کے لیے وہ یہ جال بن رہا ہے وہ اس جال سے واقف ہے۔

لیکن مکر کے معنی ہیں کسی کو نقصان پہونچانے کے لیے خفیہ تدبیر کرنا اور خفیہ تدبیر کا استعمال وہی کرتا ہے جو کمزور ہو، لیث وغیرہ کا یہی خیال ہے کہ مَکْر خفیہ چال چلنے کو کہتے ہیں، جنگ میں چال چلنا تو جائز ہے لیکن ہر حلال اور جائز کام میں مکر کا استعمال حرام ہے۔(۱۲)

مکر کے معنی دھوکا دینے اور کسی کو تکلیف دینے کے لیے فریب کاری کے استعمال کے بھی ہیں، کچھ لوگوں نے مکر اور کید کو مترادف الفاظ کے طور پر استعمال کیا ہے، لیکن بعض لوگ ان دونوں میں تفریق کرتے ہیں اور مکر کو ناجائز اور کید کو جائز کہتے ہیں۔(۱۳)

کید ہی سے ملتا جلتا لفظ توریۃ ہے جس کی شریعت نے اجازت دی ہے، چناں چہ احادیث میں جنگ میں کید کے استعمال کو مباح قرار دیا گیا ہے، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح کے موقعہ پر توریہ سے کام لیتے تھے۔(۱۴)

چناں چہ قرآن نے خدا کے لیے "مَکْر" کا استعمال محض مجانست اور صوتی ہم آہنگی کی وجہ سے کیا ہے، مثال کے طور پر قرآن کہتا ہے:

وَ مَکَرُوْا و مَکَرَ اللّٰہُ واللّٰہُ خیرُ الماکِرِیْنَ ۔ (آل عمران: ۵۴)

"اور انھوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ بہترین خفیہ تدبیر کرنے والا ہے"۔

یہاں اللہ تعالیٰ یہ کہنا چاہتا ہے کہ سیدنا مسیحؑ کے متعلق یہود کے علماء و اکابر نے بڑی سازشیں کیں، انھوں نے اپنے اسلاف کی روایات توڑنے اور بزرگوں کی توہین و تحقیر کا الزام لگایا،

Marfat.com

آپ کے پاس اپنے آدمی بھیج بھیج کر ایسے سوالات کیے جن کے جوابات سے آپ کے خلاف کفر و ارتداد کے فتویٰ کا مواد فراہم ہو سکے، آپ کے بارہ شاگردوں میں سے ایک شاگرد یہودا کو جو منافق تھا، رشوت دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ آپ کی مخبری کرے اور آپ کو گرفتار کرا دے، لیکن اللہ نے اس کے مقابلے میں یہ تدبیر فرمائی کہ آپ کو نہایت عزت و اکرام کے ساتھ اپنی جانب اٹھا لیا اور دشمن جو قتل کے درپے تھے منہ دیکھتے رہے۔

یہاں اللہ کی طرف "مکر" کی نسبت اپنے حقیقی مفہوم میں نہ ہو کر بر سبیل مشاکلت استعمال ہوئی ہے۔(۱۵)

Marfat.com

۳- نہی کے ساتھ قید

یہ قرآن پاک کا ایک اہم اسلوب ہے جس سے ناواقفیت ایک طالب علم کو بڑی الجھن میں ڈال دیتی ہے۔

نہی کے ساتھ جو قید لگی ہوتی ہے اس کا مقصود صورت حال کا اظہار اور واقعے کے گھناؤنے پن کو نمایاں کرنا ہوتا ہے، قید اس کے ساتھ محض اس لیے بڑھا دی جاتی ہے تاکہ وہ صورت حال سامنے آجائے جو اس کے ارتکاب میں مضمر ہے، مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کی مندرجہ ذیل آیت کو دیکھیے:

وَ آمِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ وَ لاَ تَكُونُوا اَوَّلَ كَافِرٍ بِه وَ لاَ تَشْتَرُوا بِآيَاتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلاً و إِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۔ (بقرہ: ۴۱)

"اور میں نے جو کتاب بھیجی ہے اس پر ایمان لاؤ، یہ اس کتاب کی تائید میں ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی، لہٰذا سب سے پہلے تم ہی نہ منکر بن جاؤ اور تھوڑی قیمت پر میری آیات نہ بیچ ڈالو اور میرے ہی غضب سے بچو"۔

اس آیت میں "ولا تكونوا اَوَّلَ كَافِرٍ به" کا ٹکڑا قابل غور ہے، یہاں یہ کہنا مقصود نہیں ہے کہ جب دوسرے کفر کرلیں تب تمہارے لیے (اہل کتاب مراد ہیں) کفر کرنا جائز ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب قرآن تمہاری کتاب کی تصدیق کرتی ہوئی نازل ہوئی ہے اور اس پر ایمان لانے کا تم سے عہد لیا جاچکا ہے، اس وجہ سے اس کو قبول کرنے اور اس پر ایمان لانے کی سب سے پہلے تم ہی سے توقع کی جاسکتی تھی لیکن یہ عجیب صورت حال ہے کہ دوسرے تو اس سے ناآشنا ہونے کے باوجود اس پر ایمان لانے میں سبقت کریں اور تم اس سے پہلے سے آشنا ہو کر اس کی مخالفت کی راہ میں پہل کرو۔

اسی طرح " وَلاَ تَشْتَرُوا بِآيٰتِي ثَمَنًا قَلِيلاً " کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر اچھے دام مل جائیں تو کتاب الٰہی کی آیات کا سودا کر سکتے ہو بلکہ نہی کا تعلق یہاں بھی فعل سے ہے۔ یعنی جس چیز سے روکا گیا ہے، وہ دین فروشی ہے لیکن ثمنا قلیلا کی قید نے یہ حقیقت بھی واضح کردی کہ دین فروشی کا یہ کاروبار نہایت ذلیل طریقہ سے ہو رہا ہے کیوں کہ اللہ کی آیات کے بدلے میں اگر تمام

Marfat.com

دنیا بھی حاصل ہو جائے تو وہ بہر حال ایک متاع حقیر ہی ہے۔(۱۶)

اسی سورہ میں آگے صدقہ وانفاق کی ایک حد یہ بتائی گئی ہے کہ یہ ان فقراء اور ضرورت مندوں کے لیے ہے جو کسی دینی مقصد کی خاطر کسب معاش کی جدوجہد سے عاجز ہوں، فرمایا:

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ أُحْصِرُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ لاَ يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ لاَ يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ إِلْحَافًا، وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّٰهَ بِهِ عَلِيْمٌ۔

(بقرہ: ۲۷۳)

"یہ ان غریبوں کے لیے ہے جو خدا کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں، زمین میں کاروبار کے لیے نقل وحرکت نہیں کر سکتے بے خبر ان کی خودداری کے سبب ان کو غنی خیال کرتا ہے، تم ان کو ان کی صورت سے پہچان سکتے ہو وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے تو اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔"

یہاں "الحاف" کے معنی لپٹ کر سوال کرنے کے ہیں، اس ٹکڑے میں اصل مقصود سوال کرنے کی نفی ہے، الحافاً کی قید محض سوال کرنے والوں کی عام حالت کے اظہار کے لیے ہے کہ بھلا جو لوگ اتنے خوددار ہیں کہ جو ان کے حال سے بے خبر ہو وہ ان کو غنی سمجھتا ہے، وہ گداگروں اور بھک منگوں کی سی حرکت کس طرح کر سکتے ہیں، چناں چہ ان کی اسی خودداری کی وجہ سے قرآن نے اہل انفاق کو ان کا سراغ دینے کے لیے ان کی پہچان یہ بتائی ہے کہ ان کو صرف چہرے بشرے سے پہچان کر ڈھونڈنے کی کوشش کرو اور ان کے پاس خود پہونچو، یہ توقع نہ رکھو کہ عام گداگروں کی طرح یہ لوگ تمہارے پیچھے پیچھے بھاگیں گے۔

اس اسلوب کی ایک مثال سورۂ آل عمران میں بھی ہے، فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لاَ تَا كُلُوا الرِّبَوا أَضْعَافًا مُضٰعَفَةً، وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (آل عمران: ۱۳۰)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو یہ بڑھتا چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔"

یہاں نہی کے ساتھ اضعافاً مضاعفۃً کی جو قید لگی ہوئی ہے، اس سے مقصود یہ نہیں ہے

Marfat.com

کہ اسلام میں ممنوع صرف سود در سود ہے، بلکہ یہ قید محض صورت حال کی تصویر اور اس کے گھنونے پن کے اظہار کے لیے ہے۔(۱۷)

یعنی یہ کس قدر ذلت اور اخلاق سے گری ہوئی بات ہے کہ جو غریب فقر و فاقہ سے مر رہے ہیں، جن کے بیوی بچے نان جویں کو محتاج ہیں، انہیں یہ یہودی و قریشی ساہوکار اور مہاجن لوٹ رہے ہیں اور ان کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں سود در سود قرض دینے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کر رہے ہیں، تو اے ایمان لانے والو، تم اس مکروہ اور پست حرکت سے دور رہو اور اس ناپاک میدان میں اضعافاً مضاعفۃً کی غلاظت کا انبار جمع کرنے کے بجائے اس جنت کے لیے بازیاں لگاؤ جس کی پہنائی آسمان و زمین کے برابر ہے۔

سورۂ نور میں اسی اسلوب کی بلاغت ملاحظہ فرمایئے:

وَلاَ تُكْرِهُوْا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى البِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِتَبْتَغُوا عَرَضَ الحَيَاةِ الدُّنيَا۔ (نور : ۳۳)

اور اپنی لونڈیوں کو اپنے دنیوی فائدوں کی خاطر قحبہ گری پر مجبور نہ کرو جب کہ وہ خود پاک دامن رہنا چاہتی ہوں۔

یہاں یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر لونڈیاں نکاح کی قید میں آنا چاہیں تو ان سے زنا نہ کرو لیکن اگر وہ قید نکاح میں آنے کو تیار نہ ہوں تو ان کو قحبہ گری پر مجبور کیا جاسکتا ہے بلکہ "إن أَرَدْنَ تَحَصُّنًا" (اگر وہ خود پاک دامن رہنا چاہتی ہوں) کی شرط سے مقصود صرف حال کی تصویر اور اس کے نفرت انگیز ہونے کا ذکر ہے۔

جب اسلام نے زنا پر حد جاری کرنے کا حکم دے دیا اور غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کی ہدایت فرمائی'(۱۸) تو قدرتی طور پر لونڈیوں کے اندر بھی ایک عام احساس بیدار ہوا کہ وہ اپنے اخلاقی معیار کو اونچا کریں اور ان میں سے جو اپنے مالکوں (۱۹) کے دباؤ کی وجہ سے پیشہ کراتی تھیں وہ خواہش مند ہوئیں کہ یہ حرام پیشہ چھوڑ کر پاک دامنی کی زندگی بسر کریں۔ چناں چہ ان کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے اور چکلوں کے مالکوں کو تنبیہ فرماتے ہوئے کہا کہ اب ان لڑکیوں کو جب کہ وہ زنا سے توبہ کر کے پاک دامنی کی زندگی اختیار کرنا چاہتی ہیں، بدکاری پر مجبور نہ کرو۔

یہی اسلوب سورۂ بنی اسرائیل میں استعمال ہوا ہے، (۲۰) جہاں مفلسی کے ڈر سے اولاد کو

Marfat.com

قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے وہاں بھی خَشْیَۃَ إملاقٍ کی قید محض اس کے گھنونے پن کو ظاہر کرنے کے لیے ہے، یعنی اپنی اولاد کو قتل کرنے کا کام محض فقر و فاقہ اور مفلسی سے بچنے کے لیے کیا جارہا ہے جب کہ رازق والدین نہیں بلکہ وہ خدا ہے جو اولاد اور والدین دونوں کو روزی دیتا ہے۔

Marfat.com

۴- تصریف

اس لفظ کے معنی گردش دینے اور ہیر پھیر کر بیان کرنے کے ہیں، قرآن پاک کا ایک اہم اسلوب یہ ہے کہ وہ آیتوں کو الٹ پلٹ کر مختلف زاویوں سے بیان کرتا ہے، اس کے لیے اس نے تصریف آیات کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مضمون مختلف سورتوں میں بار بار آتا ہے لیکن ہر جگہ ایک ہی پیش و عقب اور ایک ہی قسم کے لواحق و تضمنات کے ساتھ نہیں آتا بلکہ ہر جگہ اس کے اطراف و جوانب اور اس کے تعلقات و روابط بدلے ہوئے ہوتے ہیں، مقام کے لحاظ سے اس میں مناسب حال تبدیلیاں ہوتی ہیں، ایک ہی چیز کبھی مرکزی مضمون کی حیثیت سے آتی ہے کبھی ضمنی مضمون کی حیثیت سے، کبھی وہی چیز اجمال کے ساتھ آتی ہے کبھی تفصیل کے ساتھ، کبھی ایک چیز مقدم ہوتی ہے کبھی مؤخر، کبھی تنہا ہوتی ہے کبھی اپنے مقابل کے ساتھ، کبھی کسی چیز کے ساتھ اس کا جوڑ ہوتا ہے کبھی کسی چیز کے ساتھ، بالکل یکساں مضمون مختلف پہلوؤں سے جلوہ گر ہو تو اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے اور پوری طرح پہچاننے میں دقّت نہ ہوگی، اگر ایک ادا نگاہ سے چوک گئی تو دوسرا جلوہ سامنے آجائے گا۔(۲۱) قرآن پاک نے خود بھی اس تصریف کا مقصد یہی بتایا ہے کہ تاکہ لوگ سمجھ سکیں اور اس کی آیات پر غور کر سکیں، فرمایا:

اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ۔ (انعام: ٦٥)

دیکھ کس کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھ سکیں۔

اس آیت کے سیاق و سباق پر غور کرنے سے تصریف کی حقیقت بالکل آشکارا ہو جاتی ہے، کہا یہ جارہا ہے کہ انسان کا حال عجیب ہے کہ جب کسی آفت میں گرفتار ہوتا ہے تو گڑگڑا کر بھی اور دل میں چپکے چپکے بھی خدا ہی کو پکارتا ہے لیکن جب اس سے نجات پا جاتا ہے تو پھر ناشکری و نافرمانی کی وہی زندگی اختیار کر لیتا ہے جس میں پہلے مبتلا تھا یہاں تک کہ اگر خدا کی پکڑ سے اسے ڈرایا جاتا ہے تو ڈھیٹ ہو کر عذاب کا مطالبہ کر بیٹھتا ہے، اس کے بعد فرمایا کہ دیکھو کس طرح ہم اپنی قدرت کی نشانیاں اور اپنے اختیار و تصرف کی دلیلیں مختلف اسلوبوں سے ہیر پھیر کر بیان کرتے ہیں تاکہ اسے یہ سمجھیں، لیکن یہ سمجھنے کے بجائے ہمارا عذاب ہی دیکھنا چاہتے ہیں، اسی سورہ میں ذرا پہلے اسی بات کو یوں کہا گیا ہے:

انظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الآيَاتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُونَ ۔ (انعام: ٤٦)

دیکھ کس کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے پیش کرتے ہیں، پھر بھی وہ اعتراض کر رہے ہیں۔

Marfat.com

قرآن پاک نے تصریف کا لفظ ہواؤں کے لیے بھی استعمال کیا ہے اوران کے حیرت انگیز اثرات و تصرفات کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے اور فرمایا ہے کہ ہوائیں اپنے رب کے حکم کے مطابق تقسیم امر کرتی ہیں، بعض زمینوں کو جل تھل کر دیتی ہیں بعض کو نیم تشنہ اور بعض کو خشک چھوڑ جاتی ہیں اور اگر حکم الٰہی ہو تو بعض علاقوں پر وہ سیلاب و طوفان بن کر نازل ہوتی ہیں اور پورے کا پورا علاقہ ان کی لپیٹ میں آکر تباہ ہو جاتا ہے، ٹھیک یہی حال آیات الٰہی کا ہے یہ آیات کسی کے حق میں مژدۂ جانفزا ہوتی ہیں اور کسی کے لیے عذاب کا تازیانہ بن جاتی ہیں۔ (۲۲) سورۂ مرسلات میں فرمایا:

وَالْمُرْسَلاتِ عُرْفًا فالعٰصِفٰتِ عَصْفًا، والنّٰشِرَاتِ نَشْرًا، فَالفٰرِقٰتِ فَرْقًا، فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا عُذْرًا أَوْ نُذرًا إِنَّما تُوعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۔ (مرسلات: ۱-۷)

شاہد ہیں ہوائیں جن کی باگ چھوڑ دی جاتی ہے پس وہ طوفانی رفتار سے چلتی ہیں اور شاہد ہیں ہوائیں پھیلانے والی (بادلوں کو) پھر وہ معاملہ کرتی ہیں جدا جدا، پھر ڈالتی ہیں یاد دہانی اتمام حجت کے طور پر یا آگاہ کر دینے کو، بے شک جو وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ شدنی ہے۔ (۲۳)

پورے قرآن میں اصلاً تین چیزوں کی دعوت دی گئی ہے اور انہیں مختلف اسلوبوں اور پیرایوں میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اس سے کلام کی دل کشی اور جاذبیت بڑھ گئی ہے اور کہیں تکرار کا عیب پیدا نہیں ہونے پایا ہے۔

(۱) توحید (۲) معاد (۳) رسالت

قرآن نے انہی تین چیزوں کو مختلف انداز سے بار بار اس طرح دہرایا ہے کہ ہر جگہ یہ مستقل اور نیا مضمون معلوم ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر عقیدۂ توحید کو لیجیے، کہیں قرآن نے اسے انسانی فطرت کی پکار کہا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ توحید انسان کے دل کی آواز اور عین تقاضائے فطرت ہے اور شرک اس کے خلاف ہے، (۲۴) کہیں اس پر اس حیثیت سے گفتگو کی ہے کہ یہ تمام انبیاء کی مشترکہ دعوت رہی ہے اور ان سب نے اپنے اپنے زمانے میں توحید ہی کی طرف لوگوں کو بلایا ہے (۲۵) کہیں مشرکین کے اپنے نفس کی شہادت سے استدلال کیا گیا ہے کہ جب کوئی سخت وقت آتا ہے اور انہیں موت یا تباہی سامنے کھڑی نظر آنے لگتی ہے تو وہ اپنے سب بناوٹی معبودوں کو بھول جاتے ہیں اور صرف اللہ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ (۲۶) کہیں کائنات کے پورے نظام سے توحید کے حق میں زبردست دلائل دیئے گئے ہیں۔ (۲۷) کہیں خدا کے بے شمار احسانات اور اس کی بے پایاں نعمتوں کا تذکرہ کر کے انسانوں کے جذبۂ عبودیت کو مہمیز کیا گیا ہے۔ (۲۸)

Marfat.com

۵- تخلیص

اس اسلوب کو اردو شاعری کی اصطلاح میں گریز کہا جاسکتا ہے، یعنی بات میں سے بات پیدا کرنا، ایک مضمون بیان کرتے کرتے بیچ میں کوئی موقع کی ہدایت و نصیحت یا واقعہ بیان کر کے اصل موضوع کی طرف پلٹ آنا، اس کو امام ابن قیم جوزیؒ نے "تخلیص" یا "انتقال من فن إلی فن" کہا ہے اور علامہ سیوطی نے، حسن التخلص کہا ہے۔ سیوطی نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

"ایک امر حسن التخلص بھی ہے اور یہ اس بات کا نام ہے کہ متکلم نے جس چیز کے ساتھ کلام کی ابتداء کی ہے، اس سے وہ مقصود اصلی کی طرف نہایت لطیف طریقے پر منتقل ہو جائے اور اس انتقال کے وقت اس قدر دقیق معنی اس کے اندر پیدا کر دے کہ سامع کو انتقال کا پتا ہی نہ چل سکے اور معلوم بھی ہو تو اس وقت جب کہ متکلم امر اول سے امر دوم کی طرف منتقل ہو چکے اور دوسرے کلام کے معنی اس پر منکشف ہو جائیں اور اس کی وجہ یہ ہو کہ ان دونوں امور کے درمیان بڑا ربط اور میل ہوتا ہو، ابو العلاء محمد بن غانم نے یہ کہہ کر سخت غلطی کی ہے کہ قرآن میں حسن التخلص کی قسم سے کوئی بات نہیں ہے کیوں کہ اس میں تکلف ہوتا ہے اور تکلف فصاحت و بلاغت کے منافی ہے۔" (۲۹)

سورہ مومنون کا مطالعہ کیجیے، ابتداء اہل ایمان کی فلاح اور حق کی تکذیب کرنے والوں کے خسران کے اعلان سے ہوتی ہے جس میں خدا کی ربوبیت کے شواہد سے جزاء سزا پر استدلال بھی شامل ہے اور پھر یہ سلسلۂ آیت ۲۳ و علیها و علی الفلكِ تُحمَلُون (اور ان جانوروں اور کشتیوں پر سواری بھی کرتے ہو) پر ختم ہوتا ہے، آگے مکذبین کے خسران اور مومنین کی فلاح پر تاریخی شواہد کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کے واقعے کا تذکرہ ہوتا ہے جو تاریخی تقدم کے اعتبار سے بھی رسولوں کی سرگزشت کا سرنامہ ہے اور خاص طور پر کشتی ہی کو ان کی اور ان کے ساتھیوں کی نجات کا اللہ تعالیٰ نے ذریعہ بنایا، کشتی کے ذکر کے بعد اس کشتی والے کے واقعہ کا ذکر اس طرح آگیا ہے گویا بات میں سے بات پیدا ہو گئی ہے فرمایا:

وَعَلَيهَا و عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُون وَ لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَى قَومِهِ فَقَالَ يَا قَومِ اعْبُدُوا اللّٰه مَا لَكُمْ مِنْ إِلٰهٍ غَيْرُه اَفَلاَ تَتَّقُوْنَ۔ (مومنون: ۲۲-۲۳)

Marfat.com

اور ان (جانوروں) پر اور کشتیوں پر تم سواری بھی کرتے ہو ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، اس نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارے لیے کوئی معبود نہیں ہے، کیا تم ڈرتے نہیں ہو۔

تاریخی شواہد کے بعد آیت ۵۰ سے پھر اصل مضمون شروع ہو گیا ہے۔

سورۂ انبیاء آیات ۳۰ تا ۳۳ میں فرمایا: ہم نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیئے جو اس کے توازن کو برقرار رکھے ہوئے ہیں کہ مبادا وہ ان کے سمیت کسی سمت کو لڑھک کر کسی اور کرہ سے جا ٹکرائے۔ اور یہ اہتمام بھی کیا کہ ان پہاڑوں کے درمیان درّے بھی بنائے کہ وہ لوگوں کے راستے کا کام دیں اور وہ ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ اور ایک ملک سے دوسرے ملک کو آ جا سکیں، اگر خدا نے ایسا نہ کیا ہوتا تو لوگ اپنے اپنے علاقوں ہی کے اندر بند ہو کر رہ جاتے اور کسی کے امکان میں بھی نہ ہوتا کہ وہ سفر اور تجارت کی راہیں کھول سکے، اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر پہاڑوں کے اصل مقصد تخلیق کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ خدا نے اپنی یہ نشانیاں اس لیے نمایاں فرمائیں کہ ان کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں کھلیں، ان پر پہاڑوں کے خالق کی قدرت، عظمت اور حکمت کی شان واضح ہو اور وہ خدا تک پہونچ سکیں۔

وَ جَعَلْنَا فِی الْأَرْضِ رَوَاسِیَ أَنْ تَمِیْدَ بِهِمْ وَ جَعَلْنَا فِیْهَا فِجَاجًا سُبُلاً لَعَلَّهُمْ یَهْتَدُوْنَ۔ (انبیاء : ۳۱)

اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ انہیں لے کر لڑھک نہ جائیں اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں تاکہ لوگ (خدا کی طرف) رہنمائی حاصل کر سکیں۔

سورۂ قٓ میں اسی بات کو کھول کر بیان کر دیا گیا ہے:

وَالْاَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَ اَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ أَنْبَتْنَا فِیْهَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍ بَهِیْجٍ۔ تَبْصِرَةً وَ ذِکْرَی لِکُلِّ عَبْدٍ مُنِیْبٍ۔ (قٓ: ۷-۸)

اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ لنگر انداز کر دیے اور اس میں نوع بنوع کی خوش منظر چیزیں اگائیں، ہر متوجہ ہونے والے بندے کے اندر بصیرت اور یاد دہانی پیدا کرنے کے لیے۔

مندرجہ بالا آیت میں انبیاء کے مقصد تخلیق کی طرف اشارہ کر کے اگلی آیت سے پھر اصل مضمون شروع کر دیا گیا اور زمین کی نشانیوں کے بعد آسمان کی نشانیوں پر توجہ دلائی گئی۔

سورۂ نحل کی درج ذیل آیات بھی اس اسلوب کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں:

وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا ۔ لَکُمْ فِیْهَا دِفْءٌ وَ مَنَافِعُ وَ مِنْهَا تَاْکُلُوْنَ۔ وَ لَکُمْ فِیْهَا جَمَالٌ حِیْنَ تُرِیْحُوْنَ و حِیْنَ تَسْرَحُوْنَ وَ تَحْمِلُ

Marfat.com

أَثْقَالَكُمْ إِلَى بَلَدٍ لَمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلاَّ بِشِقِّ الأَنْفُسِ، إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَؤُوفٌ رَّحِيمٌ۔ وَالخَيْلَ وَالبِغَالَ وَالحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَ زِينَةً۔ وَ يَخْلُقُ مَالاَ تَعْلَمُونَ وَ عَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيلِ، وَ مِنْهَا جَائِرٌ وَ لَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ۔ (النّحل: ۵-۹)

"اس نے جانور پیدا کیے جس میں تمہارے لیے پوشاک بھی ہے اور خوراک بھی اور طرح طرح کے فائدے بھی، ان میں تمہارے لیے جمال ہے جب کہ تم انہیں چرنے کے لیے بھیجتے ہو اور جب کہ انہیں شام واپس لاتے ہو، وہ تمہارے لیے بوجھ کو ڈھو کر ایسے مقامات تک لے جاتے ہیں جہاں تم سخت جانفشانی کے بغیر نہیں پہونچ سکتے، حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا ہی شفیق و مہربان ہے اور اس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کیے تا کہ تم ان پر سواری کرو اور وہ تمہاری زندگی کی رونق ہیں اور وہ بہت سی ایسی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کو تم نہیں جانتے اور اللہ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ بتانا جب کہ راستے ٹیڑھے بھی موجود ہیں، اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔"

کس خوب صورتی کے ساتھ مقصد تخلیق اور ہدایت و رہنمائی کی طرف بیچ میں اشارہ کر دیا۔

اسی طرح سورۂ زخرف کی درج ذیل آیات میں اسی اسلوب کی رعنائی ملاحظہ فرمایئے:

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الأَرْضَ مَهْدًا وَ جَعَلَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلاً لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ، وَالَّذِي نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَنْشَرْنَابِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذَٰلِكَ تُخْرَجُونَ وَالَّذِي خَلَقَ الأَزْوَاجَ كُلَّهَا وَ جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الفُلْكِ وَالأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ، لِتَسْتَوُا عَلَى ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَ تَقُولُوا سُبْحٰنَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ وَ إِنَّا إِلَى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ۔ (زخرف: ۱۰-۱۴)

"جس نے تمہارے لیے اس زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمہاری خاطر راستے بنا دیے تا کہ تم اپنی منزل مقصود کی راہ پا سکو جس نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اتارا اور اس کے ذریعہ مردہ زمین کو جلا اٹھایا، اسی طرح تم ایک روز زمین سے برآمد کیے جاؤ گے، وہی ہے جس نے یہ تمام جوڑے پیدا کیے اور جس نے تمہارے لیے جانوروں اور کشتیوں کو سواری بنایا تا کہ تم ان کی پشت پر چڑھو اور جب تم ان پر بیٹھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو اور کہو کہ پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کر دیا ورنہ ہم انہیں قابو میں لانے کی قدرت نہیں رکھتے تھے"۔

Marfat.com

یہ آیات تخلیص کی بہترین مثال ہیں، لعلکم تھتدون سے اس لطیف اشارے کی طرف بھی توجہ دلادی کہ تم اپنے رب کی قدرت و حکمت اور اپنے حال پر اس کی بے پایاں عنایات پر غور کرو اور رب کا شکر بجالاؤ، اس طرح " إنا إلى ربنا لمنقلبون "میں بھی گریز سے کام لے کر دین کی ایک نہایت اہم حقیقت پر روشنی ڈالی ہے، یعنی انسان کو سواری پر بیٹھتے وقت صرف اتنی ہی بات نہیں یاد رکھنی چاہیے کہ ہمیں فلاں شہر سے فلاں شہر کو جانا ہے بلکہ یہ حقیقت بھی یاد رہنی چاہیے کہ ہمیں لازماً اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔

اس اسلوب کی کارفرمائی ہمیں سورہ کہف میں بھی نظر آتی ہے۔ ذوالقرنین نے فرمایا:

هٰذَا رَحْمَةٌ مِنْ رَبِّی فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّی جَعَلَهٗ دَكَّاءَ وَ كَانَ وَعْدُ رَبِّی حَقًّا ۔ (الکھف : ۹۸)

یہ میرے رب کا ایک فضل ہے، پس جب میرے رب کے وعدے کا ظہور ہوگا، اس کو ہموار کردے گا اور میرے رب کا وعدہ شدنی ہے۔

ذوالقرنین کی اس بات کو کہ جب میرے رب کے وعدۂ قیامت کے ظہور کا وقت آئے گا تو یہ ساری بلندیاں پست اور تمام تعمیرات مسمار ہو جائیں گی، اللہ نے وعدۂ قیامت کی یاد دہانی اور سرگشتگان دنیا کو تنبیہ کا ذریعہ بنالیا اور انذار کا وہ مضمون جس سے سورہ کا آغاز ہوا تھا ایک نئے اسلوب سے پھر سامنے آگیا۔ چناں چہ فرمایا:

وَ تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوْجُ فِی بَعْضٍ وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا وَ عَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِی غِطَاءٍ عَنْ ذِكْرِی وَ كَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا، أَ فَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا أَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِی مِنْ دُوْنِی أَوْلِيَاءَ إِنَّا اَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِيْنَ نُزُلًا ۔ (الکھف : ۹۸-۱۰۲)

"اور اس دن ہم چھوڑ دیں گے وہ ایک دوسرے سے موجوں کی طرح ٹکرائیں گے اور صور پھونکا جائے گا پس ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے اور اس دن ہم جہنم کو ان کافروں کے روبرو پیش کریں گے جن کی آنکھوں پر ہماری تنبیہ سے پردہ پڑا رہا اور وہ سننے کی تاب نہیں لاتے تھے، کیا ان کافروں نے گمان کیا کہ وہ میرے بندوں کو میرے سوا اپنے لیے کارساز بنالیں گے؟ ہم نے کافروں کے لیے جہنم بطور ضیافت تیار کر رکھی ہے۔

اور پھر انذار کا یہ سلسلہ سورہ کے اختتام تک چلا جاتا ہے۔"

Marfat.com

۶- تکرار

قرآن کے ایک عام قاری کواس کے مطالعے کے دوران ایک الجھن یہ محسوس ہوتی ہے کہ اسے اس کتاب میں بظاہر کوئی منطقی ترتیب نظر نہیں آتی، قرآن کے صفحات میں وہ یہ دیکھتا ہے کہ اعتقادی مسائل، اخلاقی ہدایات، شرعی احکام، دعوت و نصیحت، عبرت، تنقید و ملامت، تخویف و تبشیر، دلائل و شواہد، تاریخی قصے اور آثار کائنات وغیرہ کی طرف اشارے بار بار ایک دوسرے کے بعد آرہے ہیں اور ایک ہی مضمون کو مختلف طریقوں سے مختلف الفاظ میں دہرایا جارہا ہے لیکن یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ قرآن کوئی فلسفیانہ کتاب نہیں ہے، نہ وہ اس قسم کا تحقیقی مقالہ ہے جسے ایک ریسرچ اسکالر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لیے تیار کرتا ہے بلکہ یہ ایک دعوت اور ایک تحریک ہے جس کے مختلف مراحل اور تقاضوں کے مطابق اس کی آیات جستہ جستہ نازل ہوتی چلی گئی ہیں، اور ہر مرحلے کی ضروری ہدایات اور احکام نئے الفاظ، نئے اسلوب اور نئی آن بان سے نازل ہوتے رہے ہیں تاکہ ساری باتیں نہایت خوش گوار طریقے سے دلوں میں بیٹھ جائیں اور دعوت کی ایک ایک منزل اچھی طرح مستحکم ہوتی چلی جائے اور بنیادی عقائد واصول پہلے قدم سے آخری منزل تک کبھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائیں بلکہ ان کا اعادہ دعوت کے ہر مرحلے میں ہوتا رہے۔(۳۰)

جو لوگ قرآن کے اس انداز سے ناواقف ہیں وہ اس کی ادبی نزاکتوں اور معنوی گہرائیوں تک نہیں پہنچ پاتے اور انہیں قرآن میں بس تکرار ہی تکرار نظر آتی ہے۔(۳۱) حالاں کہ قرآن تکرارِ محض سے پاک ہے اور قرآن پر تدبر کرنے والے جانتے ہیں کہ مضامین کی یہ تکرار مختلف پیش و عقب اور لواحق و تضمنات کے ساتھ اس لیے ہوتی ہے تاکہ اس کی بات ہر طالب ہدایت کے ذہن نشین ہو جائے اور منکرین حق کے لیے قیل و قال کی کوئی گنجایش باقی نہ رہے۔ مثال کے طور پر سورۂ قمر کو لیجیے۔ اس میں درج ذیل دو آیات ٹیپ کے بند کے طور پر ہر سرگزشت کے بعد بار بار آتی ہیں:

Marfat.com

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَ نُذُرِ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۔ (۱۶-۱۷)

پس میرا عذاب اور ڈرانا کیسا ہوا اور ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے موزوں بنایا ہے تو ہے کوئی یاد دہانی حاصل کرنے والا۔ (۳۲)

ان آیات کے بار بار وارد ہونے سے کسی کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ یہ تکرار محض ہے لیکن موقع و محل پر غور کرنے سے یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ہر سرگزشت کے بعد ان آیات کا تذکرہ اس لیے کیا گیا ہے کہ مخاطب بیدار ہو جائے، سرگزشت سے نصیحت حاصل کرے اور قرآن کے مقصد نزول پر اس کی نگاہ جمی رہے۔ اس آیت سے پہلے یہ بات ارشاد ہوئی ہے کہ پیغمبر جس عذاب سے تمہیں آگاہ کر رہے ہیں، وہ ایک امر شدنی ہے۔ آفاق و انفس سب اس کے گواہ ہیں رسولوں اور ان کی قوموں کی تاریخ اس کی شاہد ہے لیکن تم مچل رہے ہو کہ جب تم اس عذاب کی نشانی دیکھ لو گے تب مانو گے حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری تعلیم و تذکیر کے لیے قرآن اتارا ہے جو ہر پہلو سے اس مقصد کے لیے جملہ لوازم سے آراستہ ہے تو تم اس عظیم نعمت سے کیوں فائدہ نہیں اٹھاتے، عذاب کے تازیانے ہی کے لیے کیوں بے قرار ہو؟ (۳۳)

مثال کے طور پر اس سورہ میں قوم نوح کے عبرت ناک انجام کی تاریخ دہرائی گئی اور جہاں یہ داستان ختم ہوئی وہیں یہ آیت فٹ کر دی گئی۔ اسی طرح قوم عاد کی تکذیب اور اس کے نتیجے میں ان کی تباہی پر تبصرہ کیا گیا اور آخر میں بطور ترجیع یہ آیت پھر دہرا دی گئی اور جہاں یہ داستان ختم ہوئی وہیں یہ آیت فٹ کر دی گئی، (۲۱-۲۲) اسی طرح قوم ثمود، قوم لوط وغیرہ کا تذکرہ ہوا ہے اور اس کے بعد ہی یہ آیت آگئی ہے جو تنبیہ و تذکیر کے لیے نہایت موزوں ہے۔

اسی طرح سورۂ مرسلات کا مطالعہ کیجیے اس میں مندرجہ ذیل آیت دس بار وارد ہوئی ہے:

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ۔ (مرسلات: ۱۵)

(تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی)

یہ خطاب ان ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں سے ہے جو ایک واضح حقیقت کو محض انانیت اور مکابرت کی وجہ سے جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں ایسے لوگوں کے کان اور آنکھیں کھولنے کے لیے ضروری تھا کہ صرف دلائل بیان کرنے پر اکتفانہ کیا جائے بلکہ ہر دلیل کے بعد بطور تنبیہ ان

Marfat.com

کے جرم اور انجام سے ان کو آگاہ بھی کر دیا جائے، اگر مخاطب کے اس مزاج کی رعایت ملحوظ نہ رکھی جاتی تو جس طرح مریض کے مزاج سے ناواقف معالج کی دوا بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے اسی طرح مخاطب کے مزاج سے نا آشنائی کی وجہ سے نعوذ باللہ کلام خداوندی بھی بے اثر ہو کر رہ جاتا۔

اس سورہ میں ہر دلیل کے بعد اس مختصر ترین جملے کے ذریعہ منکرین آخرت کو زبردست دھمکی دی ہے، اس اختصار و ابہام کے اندر جو ہولناکی مضمر ہے وہ بڑی سے بڑی تفصیل کے اندر بھی نہیں سما سکتی۔ (۳۴)

اس سورہ کی پہلی ترجیع میں فطرت کے عام احوال و معاملات سے استدلال کے لیے ہواؤں کے تصرفات سے استدلال کیا ہے کہ منکرین حق کو اپنی قوت و سطوت پر نازنہ ہونا چاہیے، اللہ عذاب لانا چاہے تو اسے کوئی بڑا اہتمام نہیں کرنا ہے۔ ہوا جو بارش لاتی ہے اس میں ذرا سے تصرف سے چشم زدن میں انسانی آبادی کا نام و نشان مٹ سکتا ہے، پھر قیامت کی افراتفری کی تصویر پیش کی ہے اور آخر میں ترجیع کے بند کے ذریعے منکرین و مکذبین کو ان کے انجام سے بھی ڈرایا گیا ہے۔

اس کے بعد کلام نے اپنا رخ بدل دیا ہے اور آفاق سے استدلال کرتے ہوئے گزرے ہوئے واقعات، تاریخ کے آثار اور آزمائی ہوئی سنت سے شہادت پیش کی گئی ہے اور پچھلی قوموں کی تباہی اور ہولناکی بیان کر کے ترجیع کی آیت دوبارہ لا کر منکرین حق کو ان کے اپنے انجام سے ڈرا دیا گیا ہے۔

اس کے بعد انفسی دلیل دی گئی ہے اور انسان کی خلقت کے مختلف مراحل بیان کر کے منکرین کو دعوت فکر دی گئی ہے۔ اس کے بعد وہی آیت ترجیع ہے اور اس کا موقع یہ ہے کہ دوبارہ پیدا کیے جانے پر جو شبہات وارد کیے جا رہے ہیں ان کی تردید کے لیے تو خود ان کی خلقت ہی کافی ہے ایک دن وہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور وہ جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہی خرابی کا دن ہو گا۔

پھر کائنات سے استدلال کیا گیا ہے اور انسان کی پرورش و پرداخت کے اہتمام کے ذریعے جزا و سزا پر دلیل فراہم کی گئی ہے اور پھر آیت ترجیع ہے اسی طرح پوری سورہ میں ہر جگہ ترجیع کی یہ آیت خاص مفہوم رکھتی ہے۔

اسی طرح سورہ رحمٰن کو پڑھیے اور درج ذیل آیت کی ترجیع پر غور کیجیے:

فَبِأَيِّ آلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۔ (الرحمن : ۱۳)

(تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

Marfat.com

یہاں آپ دیکھیں گے کہ اس سورہ کی ایک ایک ترجیع اپنے محل میں اس طرح جڑی ہوئی ہے جس طرح انگشتری میں نگینہ ہوتا ہے۔ یہاں منکرین حق کو ایک نئے اور اچھوتے اسلوب میں یہ سمجھایا ہے کہ یہ اللہ کی رحمانیت ہے کہ اس نے تمہاری تعلیم کے لیے قرآن اتارا۔ تمہاری فطرت کا تقاضا یہ تھا کہ اس پر لبیک کہتے اور عذاب کے ڈنڈے کا انتظار کرنے کے بجائے اس سے ہدایت حاصل کرتے لیکن یہ تمہاری کتنی بدبختی ہے کہ تم اس نعمت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے کوئی نئی نشانی دیکھنے کے لیے مچل رہے ہو، اگر کوئی نشانی ہی مطلوب ہے تو آسمان وزمین اور آفاق وانفس کی نشانیوں پر کیوں غور نہیں کرتے جو ہر روز تمہارے مشاہدے میں آتی ہیں اور تمہیں اُن حقائق کا درس دیتی ہیں، جن کی دعوت قرآن دے رہا ہے ان نشانیوں کی موجودگی میں کسی نئی نشانی کی کیا ضرورت ہے؟ اِس کے بعد آسمان وزمین کی ایک ایک نشانی پر انگلی رکھ کر توجہ دلائی ہے کہ یہ نشانیاں نہیں ہیں تو کیا ہیں، آخر اپنے رب کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاتے رہو گے۔

مثال کے طور پر اس سورہ کی پہلی ترجیع منعم کی شکر گزاری اور اس کے حقوق کی ادائی پر ابھارتی ہے اور جو لوگ تکذیب پر اڑے ہوئے ہیں، ان کی سرزنش کرتی ہے کہ ہر قدم پر تمہارے سامنے تمہارے رب کی وہ نعمتیں موجود ہیں جو تمہیں مسئولیت کا احساس دلا رہی ہیں لیکن تم انکار کیے جا رہے ہو تو اس کی کن کن عنایتوں کی تکذیب کرو گے؟

دوسری ترجیع (۱۴-۱۶) میں انسانی خلقت کے مختلف مراحل سے جزا وسزا پر استدلال کیا گیا ہے کہ جس طرح اس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا اسی طرح دوبارہ پیدا کرے گا تم اپنی خلقت اول کی تردید اور انکار نہیں کر سکتے۔ اس طرح خلقت ثانی سے انکار کی بھی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

تیسری ترجیع (۱۷-۱۸) میں اللہ کی عظمت وشان کے حوالے سے دلیل فراہم کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ جس اللہ کی عظمت وشان کا یہ حال ہے کہ مشرق ومغرب سب اس کے زیر نگیں ہیں، اگر اس کے انذار کو ہوائی سمجھتے ہو تو آخر اس کی کن کن عظمتوں کا انکار کرو گے؟

چوتھی ترجیع اضداد کے توافق کے پہلو سے توحید کی دلیل فراہم کر رہی ہے اور منکرین کو متنبہ کر رہی ہے کہ اگر ان روشن شواہد کے بعد بھی تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے دیوی دیوتا اللہ کی پکڑ سے تم کو بچا لیں گے تو آخر اپنے رب کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاؤ گے؟ اسی طرح پوری سورہ میں ترجیع اپنے موقع ومحل میں فٹ ہے اور ہر نئی دلیل کے بعد تذکیر وتنبیہ اور سرزنش کر رہی ہے۔

Marfat.com

یہی حال سورہ شعراء کا ہے اس میں بطور ترجیع آٹھ بار یہ آیات وارد ہوئی ہیں:

إِنَّ فِی ذَٰلِكَ لَآيَةً وَ مَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ و إِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (۸-۹)

اس میں بے شک بہت بڑی نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور بے شک تمہارا رب غالب بھی ہے اور مہربان بھی۔

یہاں ہر سرگزشت کے بعد ان آیات کے دہرانے کا مقصد یہ ہے کہ منکرین نبوت کو تنبیہ کی جائے اور ہر واقعہ یاد دلا کر یہ حقیقت ان کے ذہنوں میں بٹھادی جائے کہ رسولوں اور ان کے مکذبین کی تاریخ اور اس باب میں سنت الٰہی وہ ہے جو بیان ہوئی اس لیے ان لوگوں کی تقلید کرنے سے بچیں جو خدا کے عذاب میں گرفتار ہوئے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان سرکشوں کو جب چاہے پکڑ سکتا ہے وہ عزیز ہے لیکن وہ ان کو توبہ و اصلاح کے لیے مہلت دیتا ہے اس لیے کہ وہ رحیم بھی ہے۔ (۳۵)

اسی طرح انسان کی ناشکری اور کفران نعمت پر قرآن میں بار بار تعجب اور افسوس کا اظہار کیا گیا ہے لیکن ہر جگہ ایک نیا مفہوم، جدا اسلوب اور اچھوتا طرز بیان ہے جو مقصد کی توضیح کے لیے نئے نئے گوشوں اور سمتوں کو اجاگر کرتا ہے، مثال کے طور پر سورہ یونس اور سورہ زمر کی دو آیات کا تقابل کیجیے اور دیکھیے کہ تکرار کے اسلوب نے کیا کیا جدتیں پیدا کی ہیں اور دونوں میں کسی قدر فرق موجود ہے۔

سورہ یونس میں فرمایا:

وَ إِذَا مَسَّ الإنسانَ الضُرُّ دَعَانَا لِجَنبِهِ أو قَاعِدًا أو قَائماً فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّہ مَرَّ كَأَنْ لم يَدْعُنَا إِلَى ضُرٍّ مَسَّهٗ كَذلك زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُون (۱۲)

اور انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تب تو لیٹے بیٹھے یا کھڑے ہم کو پکارتا ہے پھر جب ہم اس کی تکلیف دور کر دیتے ہیں تو اس طرح چل دیتا ہے گویا کسی تکلیف کے لیے جو اس کو پہنچی، اس نے ہم کو پکارا ہی نہ تھا، اسی طرح حدود سے تجاوز کرنے والوں کی نگاہوں میں ان کے اعمال کھبا دیے گئے ہیں۔

یہی مضمون سورہ زمر میں اس طرح بیان ہوا ہے:

Marfat.com

و إذَا مَسَّ الإنسانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّه مُنِيبًا إلَيهِ ثُمَّ إذَا خَوَّلَهُ نِعْمَة مِنْهُ لَنَسِىَ مَا كَانَ يَدْعُو إليه مِنْ قَبلُ ، وَ جَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهِ۔ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفرِكَ قليلاً اِنَّكَ مِنْ أصحابِ النَّارِ۔ (۸)

(اور جب انسان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتا ہے اس کی طرف متوجہ ہو کر، پھر جب وہ اپنی طرف سے اس کو فضل بخش دیتا ہے تو وہ اس چیز کو بھول جاتا ہے جس کے لیے پہلے پکارتا رہا تھا اور اللہ کے شریک ٹھہرانے لگتا ہے کہ اس کی راہ سے لوگوں کو گمراہ کرے، کہہ دو اپنے کفر کے ساتھ کچھ دنوں بہرہ مند ہو لو، تم دوزخ والوں میں سے بننے والے ہو)

یہ دونوں آیات ایک ہی مضمون کو بیان کرنے کے لیے وارد ہوئی ہیں اور بظاہر ان میں تکرار ہے لیکن مندرجہ ذیل نکات پر غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ دونوں میں لفظی و معنوی اعتبار سے کتنا فرق ہے۔

۱۔ سورہ یونس کی مندرجہ بالا آیت اس آیت کے بعد واقع ہوئی ہے:

ولو يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالخَيْرِ لَقُضِىَ إلَيهِمْ أجَلُهُمْ۔ (۱۱)

(اگر اللہ لوگوں کے لیے عذاب کے معاملے میں ویسی ہی سبقت کرنے والا ہوتا جس طرح وہ ان کے ساتھ رحمت میں سبقت کرتا ہے تو ان کی مدت تمام کر دی گئی ہوتی)

پھر گفتگو کا رخ اس جانب مڑ گیا ہے کہ عذاب کے لیے جلدی مچانے کا معاملہ تو دور کی بات ہے خود مطالبۂ عذاب انسان کی طبیعت اور اس کے مزاج کے خلاف ہے کیونکہ جب اسے تکلیف لاحق ہوتی ہے اور وہ پریشانیوں میں گھر جاتا ہے تو اپنے خدا ہی کو پکارتا ہے، اس لیے جو عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں وہ اپنے مطالبے میں صادق نہیں ہیں کیوں کہ یہ ان کی فطرت تخلیق کے خلاف ہے۔

اس کے بالمقابل آخر الذکر آیت کا موقع و محل الگ ہے، یہاں زیر بحث آیت درج ذیل آیت کے بعد وارد ہوئی ہے۔

إنْ تكفُرُوا فَإنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنْكُمْ ولا يَرضَى لِعِبَادِهِ الكُفرَ وَ إنْ

Marfat.com

تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ و لاَ تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى ثُمَّ إلى رَبِّكُمْ مَرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بما كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ إِنَّهُ عليم بِذَاتِ الصُّدُور۔ (زمر : ۷)

اگر تم ناشکری کرو گے تو خدا تم سے بے نیاز ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری کا رویہ پسند نہیں کرتا اور اگر تم اس کے شکر گذار ہو گے تو اس کو پسند کرے گا اور کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ نہیں اٹھائے گی پھر تمہارے رب ہی کی طرف تمہاری واپسی ہے تو وہ تمہیں ان کاموں سے آگاہ کرے گا جو تم کرتے رہے ہو، وہ سینوں کے بھیدوں سے بھی باخبر ہے۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کفر و شرک سے بے نیاز ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں ہے بلکہ تمام مخلوقات اس کی محتاج ہیں اگر ہم اس کے شکر گذار رہیں گے تو وہ اس کو پسند فرمائے گا اور اگر ناشکری کریں گے تو اس کا نتیجہ بھی سامنے آجائے گا۔ انسان کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اللہ کے حضور آہ و زاری کرتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس مصیبت کو ٹال دیتا ہے تو وہ مصیبت کو بھول کر اللہ کے بخشے ہوئے فضل میں دوسرے شریکوں کو شامل کرلیتا ہے اس لیے کہ اس کو اللہ پر یقین نہیں ہے، آخرت کی جواب دہی کا احساس ختم ہو چکا ہے اگر آخرت کا خوف ہوتا تو اس کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرتا اور اس کی خدائی میں کسی کو شریک نہ ٹھیراتا۔

۲۔ پہلی آیت میں دَعَانَا کے الفاظ ہیں جب کہ دوسری آیت میں دَعَا رَبَّه کے کلمات ہیں، یہاں رَبَّه کے ذریعے یہ معنویت پیدا ہو گئی ہے کہ خود انسان کی فطرت میں اپنے رب کا شعور موجود ہے اور جب وہ غیر اللہ کو شریک کرتا ہے تو گویا اپنی فطرت سے بغاوت کرتا ہے۔

۳۔ پہلی آیت میں انسان سے مراد اس کی جنس ہے یعنی یہ مزاج اور طبیعت ہر انسان کے اندر ودیعت ہے لیکن سورۂ زمر میں انسان سے مراد اس جنس کی ایک خاص نوع ہے یعنی کافروں کو مراد لیا گیا ہے۔ کیوں کہ معا بعد جَعَلَ لِلّٰهِ أَنْدَادًا کا جملہ موجود ہے جو اس امر کی دلیل ہے کہ یہاں انسان سے عام انسان مراد نہیں ہے۔

۴۔ سورۂ یونس والی آیت میں صرف "كَشْفِ ضُرّ" یعنی تکلیف دور کرنے کا تذکرہ ہے لیکن سورۂ زمر کی آیت میں اس سے آگے بڑھ کر "تخویل نعمت" یعنی مزید نعمت عطا کرنے کا بیان ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کفار و مشرکین کی ہٹ دھرمی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب ان کی مصیبت دور کر دیتا ہے اور انہیں مزید انعامات سے نوازتا بھی ہے تب بھی ان کو ہوش

Marfat.com

نہیں آتا اور شرک پر ان کا اصرار باقی رہتا ہے۔

۵۔ پہلی آیت میں لما کا جواب اس بیان پر مشتمل ہے کہ وہ مصیبتوں سے نکلنے کے بعد پھر دنیوی چلت پھرت اور مادی دوڑ بھاگ میں مشغول ہو جاتا ہے اور اس سنت الٰہی سے غافل ہو جاتا ہے جو ہر خیر و شر کے پیچھے کار فرما ہوتی ہے۔ لیکن دوسری آیت میں إذا کے جواب میں دو چیزیں بیان ہوئی ہیں، ایک تو تکلیف کو بھول جانا اور دوسرے اپنے رب کو فراموش کر دینا اور اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھیرانا۔

۶۔ پہلی آیت میں صرف اس امر کا تذکرہ ہے کہ یہ شیطان کی تزئین اور ملمع کاری ہے لیکن دوسری آیت میں نہایت واشگاف آواز میں تہدید ہے، دھمکی دی جا رہی ہے کہ اپنے کفر سے چند روز اور متمتع ہو لو۔ آخر کار تمہیں جہنم کا ایندھن بننا ہے۔(۳۶)

اس طرح جو چیزیں تکرار محض معلوم ہو رہی تھی وہ بہت سے نئے معانی کی تاسیس و تفہیم کا ذریعہ بن گئی ہیں گرچہ دونوں آیات کا بنیادی مفہوم ایک ہے اس طرح قرآن کی تمام آیات جن میں بظاہر تکرار ہے، کا باہم تقابل کیا جا سکتا ہے۔

کیا تکرار کا یہ اسلوب بنی اسرائیل کے لیے خاص تھا؟

بعض علماء و مصنفین نے لکھا ہے کہ تکرار کا یہ اسلوب بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص ہے یا جہاں ان کی داستان بیان ہوئی ہے، وہاں تفصیل، تکرار اور اطناب کی زبان استعمال ہوئی ہے تاکہ زیادہ بہتر طریقے سے تشریح و تفہیم ممکن ہو سکے اور وہ حقائق کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔(۳۷)

مثال کے طور پر اہل مکہ کو خطاب کیا جاتا ہے تو معبودان باطل کی بے وقعتی ظاہر کرنے کے لیے مکھی اور مچھر کی مثالیں دی جاتی ہیں، تشبیہات و استعارات کا بکثرت استعمال ہوتا ہے اور مختصر و جامع الفاظ اور جملوں کے ذریعے مطلب کی ادائیگی ہوتی ہے لیکن بنی اسرائیل کا قصہ چھڑتا ہے تو پوری شرح وبسط کے ساتھ اس کی تمام تفصیلات بیان کی جاتی ہیں اور بار بار ان کا اعادہ ہوتا ہے،(۳۸) لیکن یہ نکتہ پورے قرآن پر منطبق ہوتا دکھائی نہیں دیتا اس لیے کہ اہل عرب کو جہاں خطاب کیا گیا ہے وہاں بھی تفصیل موجود ہے، اصل بات یہ ہے کہ بنیادی عقائد، اصول و تعلیمات اور ارکان ایمان و اسلام پر جہاں گفتگو کی گئی ہے وہاں زیادہ جامع انداز اختیار کیا گیا ہے لیکن جہاں احکام و قوانین کا تذکرہ ہے

Marfat.com

وہاں قدرے تفصیل اور وضاحت سے کام لیا گیا ہے، پھر اس حقیقت کو نظر انداز کرنا بھی مشکل ہے کہ خود یہود اشارہ و کنایہ اور شعر و ادب کی زبان بخوبی سمجھتے تھے اور سموءل بن عادیا اور کعب بن اشرف جیسے ممتاز شعراء ان کے یہاں موجود تھے، مزید برآں قرآن اہل عرب اور یہود اور سارے ہی مذاہب کے پیروکاروں کو خطاب کرتا تھا اور ہر قسم کے انسان اس کی آیات سنتے تھے لیکن کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ ہمیں اشاری و رمزیاتی زبان چاہیے، یا ہم اطناب و تکرار کے خوگر ہیں۔

جاہلی شعراء اس اسلوب سے مانوس تھے:

نزول قرآن سے پہلے جاہلی ادب میں یہ اسلوب بکثرت استعمال ہوتا تھا، عرب شعراء اس اسلوب سے نہ صرف آشنا تھے بلکہ اپنے کلام میں حسب ضرورت اس کو جگہ دیتے تھے، مثال کے طور پر عبید بن الابرص الأسدی کہتا ہے:

نحمي حقيقتنا و بعض القوم يسقط بين بينا
هلا سألت جموع كندة إذ تولوا أين أينا (۳۹)

(ہم اپنی حقیقت کی حفاظت کرتے ہیں جب کہ بعض قومیں کمزور اور بزدل ثابت ہوتی ہیں تم نے کیوں نہیں کندہ کے فوجیوں سے پوچھا جب کہ وہ پیچھے ہٹ رہے تھے کہ بھگوڑو کہاں بھاگے جا رہے ہو؟)

یہاں ان دونوں اشعار میں شاعر نے أین أین اور بین بین کی تکرار کلام میں زور پیدا کرنے کے لیے استعمال کی ہے۔ اس طرح عوف بن عطیہ بن خزع الربابی کہتا ہے:

و كادت فزارة تصلى بنا فأولى فزارة أولى فزارا (۴۰)

(قریب تھا کہ فزارہ ہم سے سکون اور ہمدردی حاصل کرتی، افسوس ہے فزارہ پر افسوس ہے فزارہ پر)

اس طرح مہلہل بن ربیعہ کا وہ مرثیہ پڑھیے جو اس نے اپنے بھائی کلیب کی موت پر کہا ہے، یہ پہلا قصیدہ ہے جس میں تیس اشعار ہیں اور ترجیع کا بند دس بار استعمال کیا گیا ہے۔

۱- على أن ليس عدلا من كليب   إذا خاف المغار على المغير
۲- على أن ليس عدلا من كليب   إذا طرد اليتيم عن الجزور

Marfat.com

٣- على أن ليس عدلا من كليب إذا ماضير جار المستجير
٤- على أن ليس عدلا من كليب إذا ضاقت رحيبات الصدور
٥- على أن ليس عدلا من كليب إذا خاف المخوف من الثغور
٦- على أن ليس عدلا من كليب إذا طالت مقاساة الأمور
٧- على أن ليس عدلا من كليب إذا هبت رياح الزمهرير
٨- على أن ليس عدلا من كليب إذا وثب المثار على المثير
٩- على أن ليس عدلا من كليب إذا برزت مخبأت الخدور
١٠-على أن ليس عدلا من كليب إذا هتف المثوّب بالعشير(٤١)

ترجمہ:

١۔ قاتل کا کلیب سے کیا مقابلہ ہو سکتا تھا جب کہ لوگ حملہ آور سے خوف کھانے لگتے تھے!
٢۔ قاتل کلیب کا کوئی ہمسر نہ تھا جب کہ یتیم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جاتا تھا!
٣۔ کلیب کا کوئی مد مقابل نہ تھا جب کہ پناہ کے طالب کے پڑوسی پر ظلم کیا جاتا تھا۔
٤۔ کلیب کی کوئی نظیر نہ تھی جب کہ سینوں کی کشادگیاں تنگیوں میں تبدیل ہو جاتی تھیں۔
٥۔ کلیب کا کوئی حریف نہ تھا جب کہ بزدل سرحدوں سے خوف کھانے لگتے تھے۔
٦۔ کلیب کا حریف بننا ممکن نہ تھا جب کہ سخت معاملات دراز ہو جاتے تھے۔
٧۔ کلیب کا کوئی مثیل نہ تھا جب کہ سخت ٹھنڈک کی ہوائیں چلنے لگتی تھیں۔
٨۔ کلیب کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا جب کہ مخاطب ابھارنے والے پر حملہ کر بیٹھتا تھا۔
٩۔ کلیب کا مقابلہ کرنا مشکل تھا جب کہ پردہ نشینوں کے پردے اٹھ جاتے تھے۔
١٠۔ کلیب سے کوئی بازی نہ لے جا سکتا تھا جب کہ فریادرس احباب واقارب سے فریاد طلب کرتا تھا۔

اسی طرح حارث بن عباد کا وہ قصیدہ بھی ملاحظہ فرمایئے جو اس نے اپنی قوم کو جنگ پر ابھارتے ہوئے کہا تھا، اس قصیدہ میں اس نے "قرّبا مربط النعامة منی" کی تکرار چودہ بار کی ہے اور ابن بدرون کے بقول پچاس سے زائد بار اس ٹکڑے کو اس نے استعمال کیا ہے:

١- قـرّبا مـربط النعامـة منـی لقحت حرب وائل عن حیال

Marfat.com

٢- قـرّبا مـربط النعامـة منـى ليس قولى يراد و لكن فعالى
٣- قـرّبا مـربط النعامـة منـى جدّ نوح النساء بالأعوال
٤- قـرّبا مـربط النعامـة منـى شاب رأسى و أنكرتنى القوالى
٥- قـرّبا مـربط النعامـة منـى للسرى و الغـدوّ والآصـال
٦- قـرّبا مـربط النعامـة منـى طال ليلى على الليالى الطوال
٧- قـرّبا مـربط النعامـة منـى لاعتنـاق الأبطـال بالأبطـال
٨- قـرّبا مـربط النعامـة منـى و اَعدِلا عن مقالة الجهال
٩- قـرّبا مـربط النعامـة منـى ليس قلبى عن القتال بسال
١٠- قـرّبا مـربط النعامـة منـى كلما هبت ريح ذيل الشمال
١١- قـرّبا مـربط النعامـة منـى لِبجيـر مفلـك الأغـلال
١٢- قـرّبا مـربط النعامـة منـى لكـريم متـوح بالجمـال
١٣- قـرّبا مـربط النعامـة منـى لا نبيعُ الرجال بيع النعال
١٤- قـرّبا مـربط النعامـة منـى لبجير فـداه عمّى و خـالى (۴۲)

ترجمہ:

۱۔ نعامہ (شاعر کے گھوڑے کا نام) کو میرے قریب لاؤ کہ وائل کی جنگ طلب مبارزت سے پھر بھڑک اٹھی ہے۔
۲۔ نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ، میرے قول کو نہیں بلکہ میرے فعل کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔
۳۔ نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ، کہ عورتوں کا نوحہ و ماتم اور ان کی چیخ و پکار بہت ہو چکی۔
۴۔ نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ، میرے سر پر بڑھاپا طاری ہو چکا ہے اور نفرت کرنے والی عورتیں مجھے اجنبی سمجھنے لگی ہیں۔
۵۔ نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ، کہ صبح و شام اور راتوں کو سفر کرنا ہے۔
۶۔ نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ، کہ لمبی راتوں سے بھی میری رات لمبی ہو چکی ہے۔
۷۔ نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ، سورما ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوں۔

Marfat.com

۸۔ نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ اور جاہلوں کی باتوں سے صرف نظر کرو۔

۹۔ نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ، میرا دل جنگ کے بغیر قابو نہ پا سکے گا۔

۱۰۔ نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ، جب جب شمال کے اطراف کی ہوا چلے۔

۱۱۔ نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ، بجیر (مقتول بیٹے کا نام) کی خاطر جو بیڑیوں کو کھولنے والا تھا۔

۱۲۔ نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ اس شریف کی خاطر جو حسن و جمال کے تاج سے آراستہ تھا۔

۱۳۔ نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ، ہم جوتوں کی طرح آدمیوں کو فروخت نہیں کرتے۔

۱۴۔ نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ بجیر کی خاطر، اس پر میرے چچا اور میرے ماموں قربان ہوں۔ (۴۳)

صاحب معلقہ عمرو بن کلثوم بادشاہ حیرہ کو دھمکی دیتے ہوئے کہتا ہے:

بأی مشیئة عمرو بن هند نکون لقیلکم فیها قطینا

بأی مشیئة عمرو بن هند تری أنا نکون الأرذلینا

بأی مشیئة عمرو بن هند تطیع بنا الوشاة و تزدرینا (۴۴)

(اے عمرو بن ہند! کس اقتدار کے بل بوتے پر تم چاہتے ہو کہ ہم تمہارے سرداروں کے غلام بنیں؟

اے عمرو بن ہند! کس اقتدار کے بل بوتے پر تم سمجھتے ہو کہ ہم ذلیل ہیں؟۔

اے عمرو بن ہند! کس اقتدار کے بل بوتے پر تم ہم سے چاکری کرانا چاہتے ہو اور ہمیں حقیر سمجھتے ہو؟)

اس اسلوب کے بعض فوائد:

قرآن نے اس اسلوب کو مختلف مواقع پر مختلف فوائد کے پیش نظر استعمال کیا ہے، جن میں سے چند ایک کی نشاندہی یہاں کی جاتی ہے:

۱۔ طول فصل کی وجہ سے جب کوئی لفظ یا مضمون ذہنوں سے اوجھل ہونے لگے تو اسے ذہن میں بٹھانے کے لیے دوبارہ ذکر کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل آیات کا مطالعہ کیجیے:

فَلَولاَ إِذَا بَلَغَتِ الحُلقُومُ وَ اَنتُم حِینَئِذٍ تَنظُرُونَ وَ نَحنُ اَقرَبُ إِلَیهِ مِنکُم وَ لٰکِن لاَ تُبصِرُونَ فَلَولاَ إِن کُنتُم غَیرَ مَدِینِینَ تَرجِعُونَها إِن

Marfat.com

كُنتُمْ صَادِقِيْنَ۔ (واقعة : ۸۳-۸۴)

اب اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو اور اپنے اس خیال میں سچے ہو تو جب مرنے والوں کی جان حلق تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے اس وقت اس کی نکلتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے ہو اس وقت تمہاری بہ نسبت ہم اس سے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتے۔

ان آیات میں اعتراض کی وجہ سے تسلسل ٹوٹتا نظر آرہا تھا اس لیے اسے سلسلۂ کلام سے مربوط رکھنے کے لیے لولا کی تکرار ہو گئی۔

لفظی تکرار کی دوسری مثال سورۂ مائدہ میں بھی ہے، سورہ مائدہ کی یہ آیت بطور خاص ملاحظہ کیجیے:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيْثَاقَهُمْ وَ كُفْرِهُمْ بِآيَاتِ اللّٰهِ وَ قَتْلِهُمُ الأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَ قَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلاَ يُومِنُونَ إِلاَّ قَلِيْلاً وَ بِكُفْرِهِمْ وَ قَوْلِهِمْ عَلَى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا۔(المائدہ: ۱۵۵،۱۵۶)

آخر کار ان کی عہد شکنی کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور متعدد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا اور یہاں تک کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں، حالاں کہ درحقیقت ان کی باطل پرستی کے سبب سے اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا ہے اور اس وجہ سے یہ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔ پھر یہ اپنے کفر میں اتنے بڑھے کہ مریم پر سخت بہتان لگایا۔

اِس طرح اللہ کا یہ قول بھی ملاحظہ فرمایئے:

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوْا السُوْءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ أَصْلَحُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَحِيْمٌ۔ (نحل : ۱۱۹)

البتہ جن لوگوں نے جہالت کی بنا پر برا عمل کیا اور پھر توبہ کر کے اپنے عمل کی اصلاح کر لی تو یقیناً توبہ و اصلاح کے بعد تیرا رب ان کے لیے غفور اور رحیم ہے۔

اس آیت میں طول فصل کی وجہ سے مفہوم منتشر ہوتا نظر آرہا تھا چناں چہ پھر "اَنَّ رَبَّكَ" کے ذریعے کلام کو مربوط کر دیا۔

سورۂ یوسف کی یہ آیت بھی اس اسلوب کی عمدہ مثال ہے:

Marfat.com

إِنِّي رَأَيْتُ احدَى عَشَرَ كَوْكَبًا والشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتهُم لِيُ سَاجِدِيْنَ۔ (۴)

میں نے گیارہ ستاروں کو دیکھا اور چاند و سورج کو میں نے دیکھا کہ وہ مجھ کو سجدہ کر رہے ہیں۔
اس آیت میں بھی "رَأَيْتهُم" کی تکرار آغاز کلام سے اتصال قائم کرنے کے لیے ہے۔

۲۔ انذار و تبشیر کے موقعوں پر بھی تکرار کا یہ اسلوب مستعمل ہے تاکہ سامعین کے دلوں میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ جائے اور وہ اس کا خاطر خواہ اثر لے سکیں۔ قرآن کا یہ انداز انذار ملاحظہ کیجیے:

أ أمِنتُم مَــنْ فِي السَّمَاءِ أن يَخسِفَ بِكُمُ الأَرضَ فإذَا هِيَ تَمُور۔
أ أمِنتُم مَنْ فِي السَّمَاءِ أن يُرسِلَ عَلَيكُم حَاصِبًا۔ فَسَتَعلَمُونَ كَيفَ نَذِيُر۔ (ملك:١٦-١٧)

کیا تم اس سے بے خوف ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تمہیں زمین میں دھنسا دے اور یکا یک یہ زمین جھکولے کھانے لگے، کیا تم اس سے بے خوف ہو جو آسمان میں ہے کہ تم پر پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیج دے پھر تم کو معلوم ہو جائے گا کہ میری تنبیہ کیسی ہوتی ہے۔

اس سورہ میں آگے اللہ تعالیٰ یوں دھمکی دیتا ہے:

قُلْ أرَأيْتُم إنْ أَهلَكَنِيَ اللّٰهُ وَ مَنْ مَعِيَ أوْ رَحِمَنَا فَمَنْ يُجِيرُ الكَافِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ أَلِيم ۔ (۲۸)

ان سے کہو کبھی انھوں نے سوچا کہ اللہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو خواہ ہلاک کر دے یا ہم پر رحم کرے کافروں کو دردناک عذاب سے کون بچالے گا؟

ایک ہی آیت کے بعد پھر کہتا ہے:

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إنْ اَصبَحَ مَاءُ كُمْ غَورًا فَمَنْ يَأتِيكُم بِمَاءٍ مَعِينٍ ۔ (ملك:۳۰)

ان سے کہو کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر تمہارے کنویں کا پانی زمین میں اتر جائے تو کون ہے جو اس پانی کی بہتی ہوئی سوتیں تمہارے لیے نکال کر دے دے گا؟

قرآن کی مندرجہ ذیل آیات بھی پڑھیے اور تکرار کے اس اسلوب پر غور کیجیے:

أفَمأمِنَ أَهْلُ القُرَى أَنْ يَاتِيَهم بَاسُنَا بَيَاتًا وَ هُم نَائِمُونَ أَوَ اَمِنَ اَهْلُ القُرَى أَنْ يَاتِيَهُم بَاسُنَا ضُحًى وَ هُم يَلعَبُونَ، أَ فَأمِنُوا مَكرَ اللّٰهِ فَلاَ

Marfat.com

يَأمَنُ مَكرَ اللّهِ إلاّ القَومُ الخاسِرُوْنَ ۔ (اعراف : ۹۷-۹۹)

پھر کیا بستیوں کے لوگ اب اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ہماری گرفت کبھی اچانک ان پر رات کے وقت نہ آجائے گی جب کہ وہ سوئے پڑے ہوں؟ یا انہیں اطمینان ہو گیا ہے کہ ہمارا مضبوط ہاتھ کبھی یکایک ان پر دن کے وقت نہ پڑے گا جب کہ وہ کھیل رہے ہوں؟ کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں؟ حالاں کہ اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو۔

ان تمام آیات میں بالترتیب أ أمنتم من فی السماء، قل أرأیتم، أو أمِن أهل القری کی تکرار انذار میں زور پیدا کرنے کے لیے ہے۔ کیا ان آیات کو سن کر منکرین حق پر لرزہ نہ طاری ہو گیا ہو گا؟

۳۔ تکرار کا یہ اسلوب تاکید کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً کسی حماسی شاعر کا کہنا ہے:

إلی معدن العز المؤثل والندی هناك هناك الفضل والخلق الجزل (۴۵)

(چلو عزت واقتدار کے مرکز کی طرف جو بہت عظیم ہے، سراپا سخاوت ہے اخلاق کریمہ اور فضیلت کی مہک وہیں میسر آئے گی۔)

قرآن کہتا ہے:

فَلَمَّا أَرَادَ أن يَّبطِشَ بِالَّذِیْ هُوَ عَدُوٌّ لَهُمَا۔ قَالَ يَا مُوسَى أَتُرِيْدُ أَنْ تَقْتُلَنِی كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بالأمْسِ، إنْ تُرِيْدُ إلاَّ أنْ تَكُونَ جَبَّارًا فِی الأرْضِ وَ مَا تُرِيْدُ أنْ تَكُوْنَ مِنَ المُصْلِحِيْنَ ۔ (قصص:۱۹)

پھر جب موسیٰ نے ارادہ کیا کہ دشمن قوم کے آدمی پر حملہ کرے تو وہ پکار اٹھا، اے موسیٰ! کیا آج تو مجھے اسی طرح قتل کرنے لگا ہے جس طرح کل ایک شخص کو قتل کر چکا ہے؟ تو اس ملک میں جبار بن کر رہنا چاہتا ہے، اصلاح کرنا نہیں چاہتا۔

ان جملوں میں تُرِيْدُ کا بار بار استعمال تاکید پیدا کرنے کے لیے ہے، ایک دوسری جگہ قرآن کہتا ہے:

قُلْ إنِّی أُمِرْتُ أنْ اَعْبُدَ اللّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّيْنَ وَ أمِرْتُ لِأَن أنْ اَكُوْنَ أوَّلَ المُسْلِمِيْنَ۔ (زمر:۱۱،۱۲)

اے نبی! ان سے کہو! مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کروں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں خود مسلم بنوں۔

Marfat.com

اس آیت میں بھی اُمِرْتُ کی تکرار زور اور تاکید پیدا کرنے کے لیے ہے، سورۂ مدثر کا مطالعہ کیجیے۔ ایک منکر خدا اور رسول کی پینترے بازیوں کے جواب میں کس طرح اس کی ہلاکت و بربادی کا اعلان کیا جارہا ہے:

فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۔ (مدثر: ۱۹،۲۰)

خدا کی مار اس پر کیسی بات بنانے کی کوشش کی خدا کی مار اس پر کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔

سورۂ انشراح میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ (۵،۶)

بیشک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ بیشک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔

ایک ہی بات کو دوبارہ دہرایا گیا تاکہ آنحضورؐ اور آپ کے صحابہ کو پوری طرح تسلی ہو جائے کہ جن حالات سے اس وقت اسلام گذر رہا ہے وہ دیرپا نہیں ہیں بلکہ ان کے بالکل قریب ہی اچھے حالات آنے والے ہیں۔

سورۂ کافرون کو دیکھیے پہلے فرمایا کہ "اے کافرو! نہ میں پوجتا ہوں جسے تم لوگ پوجتے ہو اور نہ تم پوجتے ہو جسے میں پوجتا ہوں۔" پھر اسی مضمون کا اعادہ اگلی چوتھی اور پانچویں آیات میں کیا گیا:

وَ لاَ اَنَا عٰبِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ وَلاَ أَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَا أَعْبُدُ۔ (کافرون: ۴،۵)

اور نہ میں پوجنے کا جسے تم لوگ پوجتے آئے اور نہ تم لوگ پوجنے کے جسے میں پوجتا ہوں۔

بلاغت کا تقاضہ تھا کہ یہ اعلان برأت نہایت واضح اور مؤکد لفظوں میں کیا جاتا اور یہ بلاغت قرآن کی خصوصیت ہے کہ کہیں اس میں بے فائدہ تکرار نہیں پائی جاتی، وہ ہر تکرار کے ساتھ کسی جدید فائدہ کا اضافہ ضرور کر دیتا ہے، یہ لفظ عابدون مستقبل کی تمام امیدوں کا خاتمہ کر رہا ہے اور عبدتم میں ان کے دین آبائی سے بیزاری کا اعلان ہے اور مقابلۃً اس میں زیادہ شدت اور نفرت کا اظہار ہے،(۴۶) اس کی مثال سورہ انبیاء میں بھی موجود ہے۔(۴۷)

۴۔ تکرار کا یہ اسلوب عاجزی اور مسکنت کے اظہار اور کسی بڑے کے سامنے اپنی درخواست پیش کرنے کے موقع پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کا آخری حصہ ملاحظہ ہو:

رَبَّنَا لاَ تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِينَا أَوْ أَخْطَانَا رَبَّنَا وَ لاَ تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَ لاَ تُحَمِّلْنَا مَا لاَ طَاقَةَ لَنَا بِهٖ۔ (البقرہ: ۲۸۶)

Marfat.com

اے ہمارے رب! ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائے، ان پر گرفت نہ کر، مالک ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے، پروردگار جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے وہ ہم پر نہ رکھ!

اس آیت میں ربّنا کی بار بار تکرار اپنی عاجزی کے اظہار اور درخواست کو عجز و مسکنت کا مجموعہ بنا کر پیش کرنے کے لیے ہے اور اس موقع کے لیے یہی اسلوب موزوں اور موثر ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی دعا ملاحظہ ہو:

رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَ إِلَيْكَ أَنَبْنَا وَ إِلَيْكَ الْمَصِيرُ، رَبَّنَا لاَ تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ (ممتحنہ : ۴)

اے ہمارے رب تیرے ہی اوپر ہم نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کر لیا اور تیرے ہی حضور ہمیں پلٹنا ہے اور اے ہمارے رب ہمیں کافروں کے لیے فتنہ نہ بنا دے، اے ہمارے رب ہمارے قصوروں سے درگذر فرما بے شک تو ہی زبردست اور دانا ہے۔

۵۔ تکرار کا ایک فائدہ حسرت و افسوس کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ مثلاً حسین بن خطیر معن بن زائدہ کا مرثیہ کہتا ہے:

فَيَا قَبْرَ مَعْنٍ أَنْتَ أَوَّلُ حُفْرَةٍ مِنَ الْأَرْضِ خُطَّتْ لِلسَّمَاحَةِ مَوضعًا
وَ يَا قَبْرَ مَعْنٍ كيف واريتَ جودَه و قد كان منه البرّ والبحرُ مترعًا(۴۸)

(اے معن کی قبر تو اس روئے زمین کی اولین قبر ہے جس میں سخاوت و شرافت دفن کر دی گئی ہے، اے معن کی قبر، تو نے اس کی سخاوت کو کیسے چھپا لیا جب کہ بحر و بر اس سے بھرے پڑے ہیں!)

ایک اعرابیہ اپنے بچے کا مرثیہ یوں کہتی ہے:

يَا مَنْ أَحَسَّ بنيّ اللّذين هُمَا كالدُّرّتَينِ تَشَظّى عنهما الصدفُ
يَا من أحَسّ بنى اللذين هما سَمعِي وَطَرفِي فَطَرَ فى اليوم مُختطَفُ (۴۹)

(ہائے کس نے دیکھا میرے ان دونوں بیٹوں کو جو موتیوں کی مانند تھے جن سے صدف ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ہائے کس نے دیکھا میرے ان دونوں بیٹوں کو جو میرے کان اور میری بینائی تھے، آج میری بینائی چھن گئی ہے)

Marfat.com

ان دونوں ٹکڑوں میں یا قبر معن اور یا من احسّ بنیّ اللذین هما کی تکرار درد و غم میں زور پیدا کرنے کے لیے ہے۔ سورہ قیامہ میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

أولیٰ لك فأولیٰ ثم أولیٰ لكَ فأوْلیٰ أیَحسَبُ الإنسَانُ أن یُتْرَكَ سُدَیً۔ (قیامہ : ۳۴-۳۶)

یہ روش تیرے ہی لیے سزاوار ہے اور تجھ ہی کو زیب دیتی ہے۔ہاں یہ روش تیرے ہی لیے سزاوار ہے اور تجھی کو زیب دیتی ہے، کیا انسان نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟

قصوں کی تکرار:

بلاشبہ قرآن پاک میں پچھلے انبیاء اور ان کی قوموں کی جو سرگزشتیں بیان کی گئی ہیں، ان میں اہل عقل کے لیے بڑا سامان عبرت موجود ہے بشرطیکہ وہ عقل سے کام لیں اور ان سرگزشتوں کو دوسروں کی حکایت اور داستان سمجھ کر نہ سنیں بلکہ ان سے خود اپنی زندگی کو درست کرنے کے لیے سبق حاصل کریں چناں چہ قرآن خود صراحت کرتا ہے کہ یہ کتاب اپنے آغاز کے اعتبار سے ہدایت اور انجام کے اعتبار سے رحمت ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبرَةٌ لِأُولِی الألبَابِ مَاكَانَ حَدِیثًا یُفْتَرى وَ لٰكِنْ تَصْدِیقَ الَّذِی بَیْنَ یَدَیْهِ و تَفْصِیلَ كُلِّ شَيْءٍ وَ هُدیً وَ رَحْمَةً لِقَوْمٍ یُومِنُونَ۔ (یوسف: ۱۱۱)

ان انبیاء کی سرگزشتوں میں اہل عقل کے لیے بڑا سامان عبرت ہے، یہ کوئی گھڑی ہوئی چیز نہیں ہے بلکہ تصدیق ہے اس چیز کی جو اس سے پہلے موجود ہے اور تفصیل ہے ہر چیز کی اور ہدایت ورحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے۔(۵۰)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ واقعات اور قصے قرآن پاک میں ایک سے زیادہ جگہوں پر مکرّر کیوں بیان ہوئے ہیں؟ کیا ان کا مقصد محض تذکیر ویاد دہانی ہے، (۵۱) یا اُن میں گوناگوں حکمتیں موجود ہیں، علماء نے اس تکرار کے متعدد فوائد گنائے ہیں مثال کے طور پر:

۱۔ اس تکرار سے قرآن کی اعلیٰ درجہ کی بلاغت اور انسانی طاقت سے ماوراء فصاحت کا

Marfat.com

اظہار ہوتا ہے، قرآن میں جہاں کہیں کسی قصے کی تکرار ہوتی ہے، اسلوب بدلا ہوا ہے الفاظ مختلف ہیں، سیاق و سباق جدا ہیں اور قصہ کے صرف انہی پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے جو اس مقام پر ضروری محسوس ہوئے ہیں بقیہ اجزاء سے یا تو صرف نظر کیا گیا ہے یا سرسری طور پر ان کا تذکرہ ہو گیا ہے، اس سے قرآن پاک کا اعجاز کھل کر سامنے آجاتا ہے، جو قرآنی ادب کے مقاصد میں تو نہیں لیکن اس کے لوازم میں ضرور شامل ہے۔

۲۔ اس تکرار سے جن معانی کو ذہن نشین کرنا مقصود ہوتا ہے وہ اچھی طرح ذہن و دماغ میں رچ بس جاتے ہیں کیوں کہ تکرار سے تاکید و توضیح کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔(۵۲)

۳۔ قصوں کی بار بار تکرار سے سارے انبیاء کی مکمل داستان محفوظ ہو گئی، اگر تکرار نہ ہوتی تو قصوں کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا، مثال کے طور پر حضرت موسیٰؑ کی داستان ایک قوم کے پاس محفوظ ہوتی اور عیسیٰؑ کی داستان کسی اور کے پاس ہوتی، اس طرح سارے قصے منتشر ہو جاتے۔

۴۔ انبیاء کے ان قصوں کا بار بار اعادہ کر کے نبی اکرمؐ کو تسلی دی گئی اور مصائب و آلام کے ماحول میں آپ کی تثبیت قلب کا سامان کیا گیا، چناں چہ قرآن خود کہتا ہے کہ یہ سرگزشتیں ہم اس لیے سناتے ہیں کہ ان کے وہ پہلو ہم تمہارے سامنے لائیں جو تمہارے دل کو مضبوط کریں تاکہ ان حالات کا پامردی اور استقلال کے ساتھ مقابلہ کر سکو جو تمہیں پیش آئے ہیں یا آئندہ پیش آسکتے ہیں۔ فرمایا:

> وَ كُلاًّ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ۔ (ھود:۱۲)
>
> اور ہم رسولوں کی سرگزشتوں میں سے ہر ایک تمہیں سنا رہے ہیں جن سے تمہارے دل کو تقویت دیں۔(۵۳)

تکرار کی اصل حکمت:

لیکن درج بالا فوائد اور حکمتیں عام ہیں اور بظاہر ان میں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی، جن لوگوں نے قرآن پاک کا نظم کلام کی روشنی میں مطالعہ کیا ہے اور ایک ہی قصہ کو اس کے مختلف مقامات کے تقابل کے ساتھ دیکھا ہے وہ اس بات کو اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں کہ اگر کسی مقام پر واقعے کے ایک پہلو کو نمایاں کر کے بیان کیا گیا ہے تو دوسرے مقام پر اس کے کسی دوسرے پہلو

Marfat.com

کو۔ گویا سابقہ آیات کے سیاق و سباق میں واقعے کے کسی خاص پہلو پر زور دینا مقصود ہوتا ہے۔ کیوں کہ جس طرح ایک دلیل مختلف دعوؤں پر اثر کرتی ہے، اسی طرح ایک قصے سے مختلف نتائج مستنبط ہوتے ہیں اور متعدد موقعوں پر ان سے استشہاد کیا جاتا ہے، اس لیے ان قصوں کے اعادہ سے مختلف نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ (۵۴)

قصہ آدمؑ و ابلیس:

مثال کے طور پر قصۂ آدم و ابلیس کا مطالعہ کیجیے۔ یہ قرآن میں سات مقام پر بیان ہوا ہے لیکن ہر جگہ پس منظر، مقصد تکرار اور لواحق و تضمنات بدلے ہوے ہیں اور ہر مقام پر واقعہ کے اس خاص پہلو پر زور دینا مقصود ہے جو دوسری جگہ پر مقصود نہیں ہے۔

مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کو لیجیے، آیت ۳۰ سے ۳۹ تک دس آیات میں یہ قصہ بیان ہوا ہے، اس سے پہلے ان لوگوں کا حال بیان ہوا ہے جو اس کتاب پر ایمان لائیں گے اور ان لوگوں کا بھی جو ایمان نہیں لائیں گے، بلکہ اعراض و استکبار، تعصب و ہٹ دھرمی اور عناد و مخالفت کی راہ اپنائیں گے۔ خاص طور سے یہودیوں کو متنبہ کیا گیا ہے اور ان کی چالوں سے بنی اسمٰعیل کو ہوشیار کیا گیا ہے اور اس کے بعد آگے کی دس آیات میں آدمؑ کی خلافت اور شیطان کی مخالفت کی سرگزشت ہے جو اپنے اندر گوناگوں حکمتیں رکھتی ہے:

۱۔ یہ سرگزشت ایک آئینہ ہے جس میں اس تمام موافقت اور مخالفت کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی، فرشتوں کا سوال کرنا اور جواب پاکر مطمئن ہو جانا ان لوگوں کی مثال ہے جو آغاز دعوت میں اسلام کے مخالف یا متردد تھے لیکن شکوک و شبہات کے بادل جیسے چھٹے وہ تحریک اسلامی کے ہراول دستے کے سپاہی بن گئے۔ لیکن جو لوگ غرور جاہ، غرور نسب یا حسد کی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف تھے وہ شیطان کی طرح عداوت میں بڑھتے چلے گئے۔

۲۔ یہ پیشین گوئی کی گئی ہے کہ جس طرح ابلیس کے غم و غصہ کے علی الرغم آدمؑ کو خلافت سے نوازا گیا، اسی طرح یہود کے حسد اور نفرت کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو غلبہ و تمکن مل کر رہے گا اور یہود ابلیس کی طرح ذلیل و خوار ہو کر رہیں گے۔

Marfat.com

۳۔ نہایت لطیف اسلوب میں ان لوگوں کو دعوت ایمان دے دی گئی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے، لیکن ان کا ایمان نہ لانا کسی حسد اور تکبر کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس وجہ سے تھا کہ آپ کی دعوت کے پہلو ابھی تک ان پر اچھی طرح روشن نہ ہوئے تھے۔

۴۔ اس حقیقت کی طرف بھی رہنمائی کر دی گئی کہ آدمؑ کی اس غلطی اور شیطان کے اس بہکاوے سے وحی کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ ہر دور میں اپنے انبیاء بھیجتا رہا ہے اور جس کی آخری کڑی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو لوگ اس ہدایت کی پیروی کریں گے وہ شیطان کی چالوں سے محفوظ ہوں گے۔ ورنہ انہیں جہنم میں جلنا ہو گا۔

سورۂ اعراف میں:

۹ تا ۲۵ آیات میں یہ واقعہ مزید تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے، اس سے پہلے کی آیات میں کفار قریش کو ملامت کی گئی ہے کہ اللہ نے اس محترم سرزمین میں تم کو قوت و شوکت بخشی، خوف سے نجات کیا اور تمہارے لیے معاش و معیشت کی راہیں کھولیں، لیکن تم خدا کے فرمانبردار ہونے کے بجائے اس کے ناشکرے اور نافرمان بن گئے:

وَ لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلاً مَّا تَشْكُرُوْن۔

(الاعراف:۱۱۰)

اور ہم نے تمہیں اس ملک میں اقتدار بخشا اور تمہارے لیے معاش کی راہیں کھولیں لیکن تم بہت ہی کم شکر گذار ہوتے ہو۔

اللہ کے احسانات کا تقاضا یہ تھا کہ تم اس چیز کی پیروی کرتے جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے اور خدا کے سوا دوسرے معبودوں اور شریکوں کی پیروی نہ کرتے، یہ خیالی اولیاء اور اصنام تمہارے کام آنے والے نہیں ہیں:

اِتَّبِعُوْا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَ لاَ تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهِ أَوْلِيَاءَ قَلِيْلاً مَّا تَذَكَّرُوْنَ۔ (الاعراف: ۳)

پیروی کرو اس چیز کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اور اس کے ماسوا سرپرستوں کی پیروی نہ کرو، بہت کم ہی تم لوگ یاد دہانی حاصل کرتے ہو!

اس کے بعد قصۂ آدم و ابلیس سنا کر قریش کو یاد دلایا کہ شیطان نے آدم اور ان کی ذریت کی

Marfat.com

ابدی دشمنی کی جو قسم کھائی تھی، وہ قسم جس طرح آدم و حوا کو دھوکا دے کر اور جنت سے نکلوا کر اس نے پوری کی، اسی طرح اس نے اپنی وہ قسم تم پر بھی پوری کرلی ہے اور تم پوری طرح اس کے جال میں پھنس چکے ہو۔

دوسری بات یہ کہ یہاں چوں کہ معاملہ کفار قریش سے تھا جو سر تا پا شرک کی نجاستوں میں آلودہ تھے، اس لیے توحید کی اصل تعلیم پر توجہ دلائی گئی اور واقعہ کے اس نمایاں پہلو کو اجاگر کیا گیا کہ شیطان کا اہل ہدف عقیدۂ توحید ہے، یہی وہ صراط مستقیم ہے جس پر گھات لگانے اور شب خوں مارنے کا اس نے الٹی میٹم دے دیا ہے کہ میں اس راہ سے ہٹا کر رہوں گا اور انسانوں کی اکثریت اس سے منحرف ہو کر خدا کی ناشکری کرنے والی بن جائے گی۔

قَالَ فَبِمَا أَغْوَيْتَنِىْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ، ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَيْمَانِهِم وَ عَنْ شَمَائِلِهِمْ وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُم شَاكِرِيْنَ۔ (عراف : ۱۶،۱۷)

بولا چوں کہ تو نے مجھے گمراہی میں ڈالا ہے اس وجہ سے میں تیری سیدھی راہ پر ان کے لیے گھات میں بیٹھوں گا، پھر میں ان کے آگے، ان کے پیچھے ان کے داہنے اور ان کے بائیں سے ان پر تاخت کروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گذار نہ پائے گا۔

تیسری بات یہ کہ یہاں اس امر کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے کہ قریش نے ہدایت رسانی کو نظر انداز کر دیا ہے اس وجہ سے شیطان نے انہیں ورغلا کر اسی طرح ان کے کپڑے اتروا لیے، اس طرح ان کی یہ بے حیائی خدا کے حکم کی تعمیل میں نہیں بلکہ شیطان کی پیروی میں ہے، یہ شیطانی اغوا کی ایک کھلی ہوئی علامت تمہاری زندگی میں موجود ہے، تم نے اپنے رب کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر اور اس کے رسولوں کی دعوت سے منہ موڑ کر اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کر دیا اور اس نے تمہیں انسانی فطرت کے راستے سے ہٹا کر اس بے حیائی میں مبتلا کر دیا جس میں وہ تمہارے پہلے باپ اور ماں کو مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ فرمایا:

يَا بَنِى آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا، اِنَّهٗ يَرَاكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ۔ (اعراف: ۲۷)

Marfat.com

اے بنی آدم شیطان تمہیں فتنے میں نہ ڈالنے پائے جس طرح اس نے تمہارے باپ ماں کو جنت سے نکلوا چھوڑا، ان کے لباس اتروا کر کہ ان کو ان کے سامنے بے پردہ کر دے، وہ اور اس کا جتھا تم کو وہاں سے تاڑتا ہے جہاں سے تم ان کو نہیں تاڑ سکتے۔

یہاں بنی آدم کے خطاب میں جو بلاغت ہے اسے بھی نظر میں رکھنا چاہیے۔ فرمایا کہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آدم کی اولاد اپنے باپ کے ساتھ شیطان اور اس کی ذریت کی اس دشمنی کو بھول جائے جو سراسر کینہ اور حسد پر مبنی تھی۔

سورۂ حجر میں:

آغاز میں کفار کے بارے میں یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ آج یہ لوگ اس کتاب کا انکار کر رہے ہیں لیکن ایسا وقت آئے گا جب یہ تمنا کریں گے کہ کاش اس کتاب کو قبول کر کے مسلمان بنے ہوتے اور ہولناک نتائج سے محفوظ رہتے، جس سے اس بات کی وضاحت ہو گئی کہ آج جو لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں اور غرور و تکبر کے ساتھ خدا کے رسول کی تکذیب کر رہے ہیں ان کے کفر اور تکبر کا اصل سبب یہ نہیں ہے کہ رسولوں کی صداقت ثابت کرنے کے لیے دلائل موجود نہیں ہیں یا ان کے مطالبوں کے جواب میں انہیں معجزات نہیں دکھائے جا رہے ہیں، بلکہ یہ لوگ دنیوی لذتوں میں مست ہیں اور لذیذ آرزوؤں کے خواب دیکھ رہے ہیں اور ابلیس کے اس فریب میں پھنس چکے ہیں۔ جس کی دھمکی اس نے اس وقت دی تھی جب اس کو آدم کے آگے سجدہ کا حکم ہوا تھا۔ اس کے بعد تفصیل سے یہ قصہ بیان ہوا ہے، جس میں چند مزید حکمتیں اور مضمرات ہیں:

۱۔ اس قصہ سے بعث بعد الموت پر بھی استشہاد کیا گیا ہے، چناں چہ واقعہ کا آغاز کرنے سے پہلے قیامت اور حشر و نشر کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

وَ إِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِ وَ نُمِيْتُ وَ نَحْنُ الوَارِثُونَ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِيْنَ، وَ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ، إِنَّهُ حَكِيْمٌ عَلِيْم۔ (حجر: ۲۳-۲۵)

اور بے شک یہ ہم ہی ہیں کہ زندہ کرتے اور مارتے ہیں اور ہم ہی سب کے وارث ہیں اور ہم ان کو بھی جانتے ہیں جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں اور ان کو بھی جانتے ہیں جو بعد میں آنے والے ہیں اور بے شک تمہارا خداوند ہی ہے جو ان سب کو اکٹھا کریگا بیشک وہ علیم اور حکیم ہے۔

Marfat.com

اس کے بعد اس حقیقت پر واقعۂ ابلیس و آدم کو بطور مثال بیان کیا گیا ہے اور یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ جس انسان کو ہم نے سیاہ اور بدبودار سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا ہے، اسے دوبارہ کیوں نہیں اٹھا کھڑا کر سکتے؟ یہی وجہ ہے کہ یہاں صرف یہی نہیں فرمایا کہ ہم نے آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ "حمأ مسنون" کا بھی اضافہ ہے جو دوسرے مقامات پر نہیں ہے۔(۵۵) یہ بالکل اس طرز کا استدلال ہے جس کی مثالوں سے قرآن پاک بھرا پڑا ہے۔ سورۂ یٰسٓ میں ہے:

أَوَ لَمْ يَرَ الإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُبِينٌ وَ ضَرَبَ لَنَا مَثَلاً وَ نَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُحْيِ الْعِظَامَ وَ هِيَ رَمِيمٌ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيْ أَنْشَاهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَ هُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ۔ (یس : ۷۷-۷۹)

کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا پھر وہ صریح جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا؟ اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے، کہتا ہے: "کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں گی؟" اس سے کہو انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلے پیدا کیا تھا اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ چوں کہ یہاں قریش کے ابلیسانہ کردار پر چوٹ کرنی تھی، اس لیے ابلیس کا کردار قدرے تفصیل سے دکھایا گیا ہے۔ چناں چہ ۳۱ تا ۴۴ آیات میں اس کی دھمکیاں وضاحت کے ساتھ نقل کی گئی ہیں۔

۳۔ اس واقعہ کے بعد قوم لوطؑ، قوم شعیبؑ، قوم ثمود وغیرہ کی عبرت ناک داستان بیان کی گئی ہے تاکہ ان اقوام کی سرگزشت بھی قریش کے سامنے آجائے، جنھوں نے ضد اور ہٹ دھرمی میں انکار کیا اور ابلیسی رعونت کا شکار ہو کر اپنی عاقبت تباہ کر لی۔

۴۔ چوتھی حقیقت یہ ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ قریش اپنی غلطی کے خود ذمہ دار ہیں، شیطان کا کوئی کام اس سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ ظاہر حیات دنیا سے دھوکہ دے کر بندگی کی راہ سے تم کو منحرف کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس سے دھوکا کھانا تمہارا اپنا فعل ہے جس کی کوئی ذمہ داری تمہارے اپنے سوا کسی اور پر نہیں ہے، چناں چہ سورۂ ابراہیم میں اس امر کی صراحت کر دی گئی ہے کہ قیامت کے دن شیطان اپنے متبعین سے اعلان برأت کرے گا وہ کہے گا:

إِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الحَقِّ وَ وَعَدْتُكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ وَ مَا كَانَ لِيَ

Marfat.com

عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلاَّ أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي. فَلاَ تَلُوْمُوْنِي وَ لُوْمُوْا أَنْفُسَكُمْ مَا أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَ مَا أَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ إِنِّي كَفَرْتُ بِمَا أَشْرَكْتُمُوْنِي مِنْ قَبْلُ. (ابراهیم: ۲۲)

بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے تم سے وعدہ کیا تو اس کی خلاف ورزی کی اور مجھے تم پر کوئی اختیار نہیں تھا، پس میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے بات مان لی تو مجھے ملامت نہ کرنا، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو، نہ میں تمہاری فریادرسی کر سکتا اور نہ تم میری فریادرسی کر سکتے، تم نے جو مجھے شریک بنالیا تو میں نے اس کا پہلے سے انکار کر دیا۔

سورۂ بنی اسرائیل میں:

آیات ۶۱ تا ۶۵ میں آدمؑ و ابلیس کا تذکرہ ہے، اس سے پہلے کفار قریش کو اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ تم اعراض و انکار کی پالیسی پر عمل نہ کرو اور اللہ نے جن نعمتوں سے تمہیں نوازا ہے ان کی ناقدری نہ کرو بلکہ شکر و اطاعت کا رویہ اختیار کرو اس کے بعد قصۂ آدم و ابلیس کو بیان کیا گیا ہے جس سے اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ان کے اعراض و انکار کا اصل سبب وہ ناشکری اور استکبار ہے جو ان کے لیڈر ابلیس کی سنت ہے، جس طرح ابلیس کو جب حکم ہوا کہ آدم کو سجدہ کرے تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں ایک برتر مخلوق ہوں، ایک خاکی مخلوق کو کس طرح سجدہ کر سکتا ہوں اسی طرح یہ لوگ بھی خدا کی نعمتیں پا کر سیادت و چودھراہٹ کے پندار میں اندھے ہو گئے ہیں اور ان کا یہ پندار ان کو اجازت نہیں دے رہا ہے کہ وہ تمہیں رسول مان کر اپنی لیڈری سے دست بردار ہو جائیں۔

چناں چہ اس واقعہ کے بعد ۶۶ تا ۶۷ آیات میں انسان کی اس حالت کی تمثیل بیان کی گئی ہے کہ جب وہ کسی مصیبت میں پکڑا جاتا ہے تب وہ خداوند کو پکارتا اور اس کے آگے روتا اور گڑگڑاتا ہے، لیکن جونہی اس مصیبت سے نجات پا جاتا ہے وہ پھر اکڑنے اور سرکشی کرنے لگتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ خدا چاہے تو پھر اسی حالت میں گرفتار کر سکتا ہے پھر انسان کی یہ کیفیت بیان کی گئی کہ:

وَ كَانَ الْإِنْسَانُ كَفُوْرًا. (بنی اسرائیل: ۶۷) اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس سورہ کے آغاز میں شرک کی تردید کی گئی ہے اور اموال و اولاد میں دوسری ہستیوں کو شریک کرنے پر کفار کو ملامت کی گئی ہے۔ فرمایا:

Marfat.com

أَفَاَصْفَاكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلاَئِكَةِ إِنَاثًا، إِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قولاً عَظِيْمًا، وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِى هَذَا الْقُرْآنِ لِيَذَّكَّرُوْا وَ مَا يَزِيْدُهُمْ إِلاَّ نُفُوْرًا۔ قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ إِذًا لابْتَغَوا إِلَى ذى الْعَرْشِ سَبِيْلاً، سُبْحٰنَهٗ و تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔ (بنی اسرائیل : ۴۰-۴۳)

کیا تمہارے رب نے تمہارے لیے تو بیٹے مخصوص کیے اور اپنے لیے فرشتوں میں سے بیٹیاں بنالیں، یہ تو تم بڑی ہی سنگین بات کہتے ہو۔ اور ہم نے اس قرآن میں گوناگوں اسلوبوں سے یہ بات واضح کر دی کہ وہ یاددہانی حاصل کریں، لیکن یہ چیز ان کی بے زاری ہی میں اضافہ کیے جارہی ہے۔ کہہ دو کہ اگر کچھ اور الٰہ بھی اس کے شریک ہوتے جیسے یہ دعوی کرتے ہیں تو وہ عرش والے پر ضرور چڑھائی کر دیتے، وہ پاک اور برتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔

اس کے بعد یہ قصہ بیان کر کے گویا اس امر کی تصریح کر دی کہ مال و اولاد میں کسی کو شریک ٹھیرانا شیطان کی گمراہیوں میں سے ہے۔

سورۂ طٰہٰ میں:

اس سورہ میں حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت تفصیل سے بیان کی گئی ہے، پھر آیت ۹۹ اور اس کے بعد کی آیات میں نئے دلائل اور نئے اسلوب کے ساتھ پھر وہی بات دہرائی گئی، آنحضرتؐ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَاءِ مَا قَدْ سَبَقَ۔ وَ قَدْ آتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا مَنْ أَعْرَضَ عَنْهُ فَإِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وِزْرًا۔ (۹۹-۱۰۰)

اس طرح ہم تمہیں ماضی کی سرگزشتیں بھی سناتے ہیں اور خاص اپنے پاس سے تمہیں بھی یاددہانی عطا کی ہے جو اس سے اعراض کریں گے وہ قیامت کے دن ایک بھاری بوجھ اٹھائیں گے۔

یعنی یہ صرف ماضی کی سرگزشت نہیں ہے بلکہ یہی کچھ تمہارے اور تمہارے مخالفین کے ساتھ بھی پیش آرہا ہے اور پیش آئے گا، اس کے بعد آیت ۱۱۵ سے قصۂ آدم و ابلیس شروع ہو گیا ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ آج جو لوگ تمہاری اس یاددہانی سے اعراض اور دوسروں کو برگشتہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ شیطان کا کردار ادا کر رہے ہیں، اس لیے انہیں شیطان کا انجام بد بھگتنے کے لیے تیار بھی رہنا چاہیے۔

Marfat.com

دوسری بات یہ کہ اس قصہ سے معاً پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکید کی گئی ہے کہ قرآن جس تدریج کے ساتھ اتر رہا ہے، اسی تدریج کے ساتھ لوگوں کو سناؤ، اس تدریج میں حکمت ہے اس کے لیے جلدی نہ کرو، جلدی میں خیر و برکت نہیں ہے، یہ بادشاہ حقیقی کا فرمان ہے، کسی سائل کی درخواست نہیں ہے، اس لیے لوگوں کے رد و قبول سے بے نیاز ہو کر جس تدریج اور ترتیب کے ساتھ یہ اتر رہا ہے لوگوں کو سناتے رہو۔ اس کے بعد حضرت آدم کا قصہ بیان ہوا ہے جس سے گویا اس امر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہی عجلت آدمؑ کی لغزش کا سبب بنی انسانی فطرت کے اس ضعف سے ابلیس نے فائدہ اٹھایا اور آدم کو ورغلا کر اللہ کی اس ہدایت سے غافل کر دیا جو ان کو ایک خاص درخت کے پھل سے اجتناب کے لیے کی گئی تھی، مقصود یہ ہے کہ یہ عجلت کسی کو بھی راس نہیں آتی ہے، اس سے پہلے حضرت موسیٰؑ کی داستان میں بھی یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ ان کی عجلت بھی ان کی اور ان کی قوم کے لیے ایک سخت آزمائش بن گئی، ان واقعات سے آنحضورؐ کو یہ تعلیم دینا مقصود ہے کہ دعوت کے معاملہ میں جلدی نہ کریں بلکہ صبر و عزم کے ساتھ درجہ بدرجہ جس طرح آپ کو ہدایت دی جا رہی ہے اپنے کام میں لگے رہیں، اگر آپ نے جلدی کی تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ آپ کی امت کی تربیت میں کمی رہ جائے اور کوئی شیطان یا سامری اس سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو کسی فتنہ میں مبتلا کر دے۔

سورۂ ص میں:

اس سورہ کے آغاز میں بتایا گیا تھا کہ یہ کتاب قرآن تو ایک نصیحت اور یاد دہانی ہے لیکن یہ کفار کبر و غرور میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔

صٓ وَالْقُرْآنِ ذِی الذِّکْرِ، بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِی عِزَّۃٍ وَ شِقَاقٍ۔ (صٓ:۱،۲)

یہ سورہ ص ہے، قسم ہے یاد دہانی سے معمور قرآن کی (کہ اس کی ہر بات برحق ہے) بلکہ جن لوگوں نے اس کا انکار کیا وہی گھمنڈ اور مخاصمت میں مبتلا ہیں۔

اس کے بعد ماضی کی بعض سرکش قوموں کا حوالہ ہے، جنھوں نے اللہ کے رسول کے ساتھ یہ تکبرانہ روش اختیار کی اور بالآخر کیفر کردار کو پہونچیں، پھر حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور دوسرے انبیاء کا حوالہ ہے، جنھوں نے بے مثال قوت و حشمت حاصل کرنے کے باوجود تکبر کا رویہ اختیار نہ کیا بلکہ ان کی شوکت و قوت میں جتنا ہی اضافہ ہوتا گیا، اتنی ہی ان کی شکر گذاری اور

Marfat.com

انابت ترقی کرتی گئی۔ آخر میں ۷۱ تا ۸۸ آدم وابلیس کا ماجرا بیان ہوا ہے اور اس کے حوالے سے اس کبر ورعونت کا شجرۂ نسب بیان کر دیا، گویا قریش کو اس آئینہ میں دکھایا ہے کہ وہ جس گھمنڈ میں مبتلا ہو کر رسول کی تکذیب کر رہے ہیں، یہ صالحین کی نہیں بلکہ ابلیس کی میراث ہے، اس لیے اگر یہ اسی سنت کو زندہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، تو اس انجام کے لیے بھی تیار رہیں جو ابلیس اور اس کی پیروی کرنے والوں کا ہوگا۔

سورۂ کہف میں:

اس سورہ میں آدم وابلیس کا ماجرا بیان کرنے سے پہلے اس دنیوی زندگی کی تمثیل پیش کی ہے جس کی محبت میں اندھے ہو کر یہ کفار قریش قرآن اور پیغمبر اسلام کی باتیں سننے کو تیار نہیں تھے، فرمایا کہ اس دنیا کی جنتی زینتیں اور رونقیں ہیں وہ ساتھ جانے والی نہیں ہیں صرف آدمی کے اعمال صالحہ اس کے ساتھ جائیں گے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيَاحُ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ مُقْتَدِرًا، الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔ و الْبٰقِيٰتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَ خَيْرٌ أَمَلاً ۔ (کہف: ۴۵،۴۶)

اور ان کو اس دنیوی زندگی کی تمثیل سناؤ کہ اس کو یوں سمجھو کہ بارش ہو جس کو ہم نے آسمان سے اتارا پس زمین کی نباتات اس سے خوب اچھیں پھر وہ چور ہو جائیں جس کو ہوائیں اڑائے لیے پھریں اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ مال واولاد دنیوی زندگی کی زینت ہیں اور باقی رہنے والے اعمال صالحہ باعتبار ثواب اور باعتبار امید تمہارے رب کے نزدیک بہتر ہیں۔

اس کے بعد آدم وابلیس کی داستان بیان کر دی تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ مال واولاد پر ریجھنا اور دنیوی زندگی پر فریفتہ ہونا ابن آدم کا نہیں بلکہ شیطان کا وطیرہ ہے جس نے تمہارے جد امجد آدمؑ کو ایسی ہی زندگی کی دلفریبیاں دکھا کر خدا کی حکم عدولی پر اکسایا تھا۔

اس طرح دیکھیے واقعہ ایک ہے لیکن ہر جگہ لواحق وتضمنات، جملوں کی ساخت وترتیب، پس منظر اور پیش منظر بدلے ہوئے ہیں اور ہر جگہ مختلف ومنفرد پہلوؤں پر زور دیا گیا ہے کہیں آدم کی خلافت اور اس کے تقاضوں پر زور دیا گیا ہے، کہیں اتباع غیر اللہ کے انجام بد سے متنبہ کرنے کے لیے

Marfat.com

یہ داستان بیان ہوئی ہے، کہیں دنیوی زندگی کی زینتوں اور رونقوں پر تنقید کرتے ہوے اس واقعہ سے مدد لی گئی ہے لیکن مجال نہیں کہ کہیں اکتاہٹ یا واقعہ کا بے جا طول یا تکرار کا عیب محسوس ہو۔

قصۂ ابراہیمؑ مختلف سورتوں میں:

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کی داستان قرآن میں مختلف مواقع پر بیان ہوئی ہے لیکن ہر جگہ مقصد اور مدعا دوسری جگہوں سے مختلف اور اسلوب بیان بدلا ہوا ہے، مثال کے طور پر سورۂ بقرہ میں سب سے پہلے آیات ۱۲۴ تا ۱۴۱ میں یہ قصہ بیان ہوا ہے جس کے چند مضمرات یہ ہیں:

۱۔ حضرت ابراہیمؑ کو امامت و پیشوائی کا جو منصب اللہ نے عطا فرمایا تھا وہ بطور وراثت نہیں بلکہ خاص عطیۂ الٰہی تھا، اس وجہ سے ان کی ذریت میں سے بھی وہی لوگ اس منصب کے سزاوار ہوں گے جو اس منصب کے شایان شان صفات کے حامل ہوں گے۔ چناں چہ فرمایا:

إِنِّی جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا، قَالَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِیْ، قَالَ لاَ يَنَالُ عَهْدِی الظالمين۔ (بقرہ: ۱۲۴)

اس نے کہا میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں ابراہیم نے عرض کیا، اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے؟ اس نے جواب دیا، میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔

۲۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے بیت اللہ کی تعمیر کے وقت ایک امت مسلم برپا کرنے اور ان کے اندر انہی میں سے ایک رسول مبعوث کرنے کی دعا کی تھی۔ (۵۶) (بقرہ: ۱۲۸-۱۲۹)

۳۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس دعاے ابراہیمی کے مظہر اور اسی ملت ابراہیمی کے داعی ہیں، (۵۶) اس لیے کہ حضرت ابراہیم نے جن صفات کی پیغمبر کے لیے دعا کی تھی (یعنی تلاوت آیات، تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعینہٖ انہی صفات کے ساتھ مبعوث ہوے اور آپ نے امیوں کے اندر عملاً وہ سارے کام انجام دیے جن کے لیے حضرت ابراہیم نے دعا فرمائی تھی۔ سورۂ جمعہ میں فرمایا:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْأُمِّيِّيْنَ رَسُوْلاً مِنْهُمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَ إِنْ كَانُوْ مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلاَلٍ مُبِيْنٍ۔ (جمعہ:۲)

Marfat.com

وہی خدا ہے جس نے بھیجا امیوں میں ایک رسول جوان کو پڑھ کر سناتا ہے، اس کی آیتیں اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، بے شک یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمرہی میں تھے۔

۴۔ ان حقائق کا تقاضا ہے کہ اہل کتاب یہودیت یا نصرانیت کے تعصب میں مبتلا نہ ہوں بلکہ اس ملت ابراہیمی کی پیروی کریں جس کی دعوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں۔

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا أٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا، وَ إِنْ تَوَلَّوا فَإِنَّما هُمْ فِي شِقَاقٍ۔(بقرہ: ۱۳۷)

پھر اگر وہ اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو ہدایت پر ہیں اور اگر اس سے منہ پھیریں تو کھلی بات ہے کہ وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں۔

اسی سورہ میں دوبارہ آیت ۲۵۸ میں حضرت ابراہیم کی زندگی کے ایک مخصوص پہلو پر زور ڈالنے کے لیے آپ کی سرگزشت بیان ہوئی ہے جس کا مقصد اس سنت الٰہی کی تمثیلی وضاحت ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں جاری ہے، وہ سنت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی نعمتوں کو اس کا فضل قرار دینے کے بجائے ان کو اپنا حق سمجھتے ہیں، جو نعمتوں پر خدائے منعم کا شکر گذار ہونے کے بجائے غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہوتے ہیں، جو خدا کی فرمانبرداری کے بجائے اپنی خدائی کے تخت بچھاتے ہیں ان پر ہدایت کی راہ نہیں کھلا کرتی، ایسے لوگ حق واضح ہونے کے بعد بھی بحث اور کٹ حجتی کی کوئی نہ کوئی راہ ڈھونڈھ ہی لیتے ہیں اور اگر بچاؤ کی کوئی راہ نظر نہ آئے تو وہ نمرود کی طرح ششدر اور مبہوت تو رہ جاتے ہیں لیکن حق کی قبولیت کا دروازہ پھر بھی ان پر نہیں کھلتا۔

اللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ، أُولٰئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْن، أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْ حَاجَّ اِبْرَاهِيْمَ فِيْ رَبِّهٖ أَنْ آتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ۔ إِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيِيْ وَ يُمِيْتُ، قَالَ أَنَا أُحْيِيْ وَ أُمِيْتُ قَالَ ابراهيمُ فَإِنَّ اللّٰهَ يَاتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِيْنَ۔(بقرہ: ۲۵۷-۲۵۸)

اللہ ان لوگوں کا کارساز ہے جو ایمان لاتے ہیں وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاتا

Marfat.com

ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے کارساز طاغوت بنتے ہیں وہ ان کو روشنی سے تاریکیوں کی طرف دھکیلتے ہیں، یہی لوگ دوزخی ہیں، یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، کیا تم نے اُس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے ان کے رب کے بارے میں اس وجہ سے حجت کی کہ خدا نے اس کو اقتدار بخشا تھا جب کہ ابراہیم نے کہا میرا رب تو وہ ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے وہ بولا کہ میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں، ابراہیم نے کہا کہ یہ بات ہے تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو اسے پچھم سے نکال دے تو وہ کافر یہ سن کر بھونچکارہ گیا اور اللہ ظالموں کو راہیاب نہیں کرتا۔

سورہ انعام میں:

حضرت ابراہیم کی سرگزشت ۷۴ تا ۹۰ کی آیات میں بیان ہوئی ہے، اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت ہے کہ ان کفار قریش سے کہہ دو کہ کیا حق واضح ہو جانے اور اللہ کی ہدایت آجانے کے بعد ہماری مت ماری ہوئی ہے کہ ہم صحرا میں گم کردہ قافلے کی طرح بھٹکتے پھریں؟ ہم تو اب اسی راہ پر چلیں گے جو خدا نے ہمارے لیے کھولی ہے اس کے بعد حضرت ابراہیم اور ان سے پہلے اور ان کے بعد پیدا ہونے والے تمام انبیاء کا حوالہ دے کر بتایا گیا ہے کہ ان سب کی دعوت یہی تھی جو یہ پیغمبر دے رہے ہیں، پھر نبی کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم بہر شکل اسی ہدایت یافتہ گروہ کی ہدایت کی پیروی کرو اگر تمہاری قوم یہ بات نہیں سنتی تو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ تمہاری ذمے داری صرف دعوت و تبلیغ کی ہے، ان کے دلوں میں ایمان اور ہدایت اتار دینا تمہارا کام نہیں ہے۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ۔ قُلْ لاَ أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِنْ هُوَ إِلاَّ ذِكْرَى للعالَمِيْن۔ (انعام :۹۰)

یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی تو تم بھی انہی کے طریقے کی پیروی کرو، اعلان کر دو، میں اس پر تم سے کسی صلہ کا طالب نہیں، یہ تو بس عالم والوں کے لیے ایک یاددہانی ہے۔

سورہ توبہ میں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرے سے پہلے نبیؐ اور اہل ایمان کو اس بات کی سختی سے تاکید کی گئی ہے کہ جن لوگوں پر حق پوری طرح واضح کیا جا چکا ہے اور جن سے اتمام حجت کے بعد

Marfat.com

اعلان برأت ہو چکا ہے، پھر بھی وہ ایمان نہ لائے ان کے لیے اہل ایمان مغفرت نہ مانگیں، اس لیے کہ اس قسم کے مخالفین اور دشمنانِ اسلام خدا کے غضب کے مستحق ہیں ان کے لیے رشتۂ قرابت یا کسی اور رابطۂ محبت کی بنا پر رحمت کی دعا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ حمیت قرابت حمیت حق پر غالب ہے، (۵۷) اس کے بعد حضرت ابراہیم کا ذکر آیا ہے۔

وَ مَا كَانَ اِسْتِغْفَارُ اِبْرَاهِيْمَ لِأَبِيْهِ إِلاَّ عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ، فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ اللّٰهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ، إِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۔ (توبہ: ۱۱۴)

اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے مغفرت مانگنا صرف اس وعدے کے سبب سے تھا جو اس نے اس سے کر لیا تھا پھر جب اس پر واضح ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس نے اس سے اعلان برأت کر دیا، بے شک ابراہیم بڑا ہی رقیق القلب اور بردبار تھا۔

اس سے قبل کی جو آیت ہے اسے بھی سامنے رکھیے تاکہ ربط اور پس منظر واضح رہے:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا أَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَ لَوْ كَانُوْا أُوْلِى قُرْبَى مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ اَصْحَابُ الْجَحِيْمِ۔ (۱۱۳)

نبی اور مومنین کے لیے روا نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے مغفرت مانگیں، اگرچہ وہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں جب کہ یہ ظاہر ہو چکا کہ یہ جہنم میں جانے والے لوگ ہیں۔

یعنی حضرت ابراہیم نے جو کچھ کیا وہ محض ایک وعدہ کا ایفاء تھا جو وہ اپنے باپ سے کر چکے تھے پھر یہ اس وقت کا معاملہ ہے جب اُن پر بات پوری طرح واضح نہیں ہوئی تھی کہ باپ فی الحقیقت اللہ کا دشمن ہے لیکن جب اس کی دشمنی آشکارا ہو گئی تو اعلان برأت کر دیا۔

سورۂ ہود میں:

حضرت ابراہیمؑ کا تذکرہ پچھلے رسولوں اور ان کی قوموں کے ضمن میں ہوا ہے، مقصود یہ ہے کہ انبیاء اور ان کے اہل ایمان ساتھی محفوظ رہے اور منکرین و مکذبین پر خدا کا عذاب آدھمکا اور وہ اس کی لپیٹ سے نہ بچ سکے، اس لیے قریش نے آج جو روش اختیار کر رکھی ہے اس کا انجام بھگتنے کے لیے وہ تیار رہیں اور دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دکھلانا ہے کہ آج جو کچھ تمہیں پیش آرہا ہے بعینہ وہی کچھ تم سے پہلے کے رسولوں کو بھی پیش آچکا ہے، اس لیے حالات سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صبر و عزیمت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنے کی ضرورت

Marfat.com

ہے، فرمایا:

وَ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيْمَ بِالْبُشْرَى قَالُوْا سَلاَمًا، قَالَ سَلاَمٌ،
فَمَا لَبِثَ أَنْ جَاءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ، فَلَمَّا رَأَ أَيْدِيَهُمْ لاَ تَصِلُ إِلَيْهِ نَكِرَهُمْ
وَ أَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً قَالُوْا لاَ تَخَفْ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَى قَوْمِ لُوْطٍ
وَإِمْرَأَتُهُ قَائِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحٰق وَ مِنْ وَرَاءِ اسْحٰق
يَعْقُوبَ قَالَتْ يَا وَيْلَتٰى ءَ أَلِدُ وَ أَنَا عَجُوزٌ وَ هٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ، إِنَّ
هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ قَالُوْا أَتَعْجَبِيْنَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ
بَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّهُ حَمِيْدٌ مَجِيْدٌ۔ فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ
إِبْرَاهِيْمَ الرَّوْعُ وَ جَاءَتْهُ الْبُشْرَى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ، إِنَّ ابْرَاهِيْمَ
أَوَّاهٌ مُنِيْبٌ، يَا إِبْرَاهِيْمُ أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ وَ إِنَّهُمْ
آتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ۔ (هود: ۶۹-۷۶)

اور ابراہیم کے پاس ہمارے فرستادے خوش خبری لے کر آئے، کہا سلامتی ہو، اس نے بھی کہا سلامتی ہو، دیر نہیں گذری کہ اس نے ان کے آگے بھنا ہوا بچھڑا پیش کیا پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں تو اس نے ان میں اجنبیت پائی اور ان کی طرف سے ایک خدشہ محسوس کیا وہ بولے کہ تم اندیشہ نہ کرو ہم تو قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں اور اس کی بیوی پاس کھڑی تھی، وہ ہنسی پھر ہم نے اس کو اسحاق کی خوش خبری دی اور اس کے آگے یعقوب کی، وہ بولی کہ ہائے شامت! کیا میں اب بچہ جنوں گی جب کہ میں خود بھی ایک بڑھیا ہوں اور میرے شوہر بھی بوڑھے ہیں! یہ تو ایک نہایت ہی عجیب بات ہوگی، وہ بولے کیا خدا کی بات پر تعجب، اللہ کی برکتیں اور رحمتیں نازل ہوں، آپ پر اے اہل بیت نبی، بے شک وہ سزاوار حمد و بزرگ ہے تو جب ابراہیم کا خوف دور ہوا اور اس کو بشارت ملی تو وہ ہم سے قوم لوط کے بارے میں بحث کرنے لگا، بے شک ابراہیم نہایت ہی بردبار، دردمند اور اپنے رب کی طرف دھیان رکھنے والا تھا، اے ابراہیم یہ بحث چھوڑو، اب تمہارے رب کا حکم ہو چکا ہے اور ان پر ایک ایسا عذاب آنے والا ہے جو ٹالے نہ ٹالا جا سکے۔

Marfat.com

سورۂ ابراہیمؑ میں:

یہاں حضرت ابراہیمؑ کا تذکرہ کرنے سے پہلے قرآن نے کفار قریش پر خدا کی بے شمار نعمتوں کا تذکرہ کیا ہے اور پھر ان کا کفران نعمت بھی بیان کیا ہے، فرمایا کہ اللہ نے انہیں حرم کی پاسبانی عطا کی اور اس کے طفیل میں تمام عرب کی سیادت و قیادت بخشی، ان کو بدویانہ اور گلہ بانی کی غیر مطمئن زندگی کی جگہ شہری زندگی کا سکون بخشا، ایک وادیٔ غیر ذی زرع میں رزق و فضل کے دروازے کھولے، بارش، کشتی، دریا، سورج، چاند، شب و روز سب کو ان کی نفع رسانی میں سرگرم کیا پھر اس کے بعد قرآن نے حضرت ابراہیم کی داستان بیان کر کے سب سے بڑی نعمت جو کفار قریش پر ہوئی اس کا بھی اظہار کر دیا یعنی بتوں کی پوجا اور شرکاء کے شرک سے اجتناب، لیکن انہوں نے ان ساری نعمتوں کی قدر نہ کی اور کفر و شکر کی زندگی اختیار کر لی اور بہت سے شرکاء و شفعاء ایجاد کر کے خلق خدا کو ان کی پرستش کی راہ پر لگا دیا۔

وَ اٰتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ، وَ إِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللّٰه لاَ تُحصُوهَا، إِنَّ الإِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّار، وَ إِذْ قَالَ ابْرَاهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا البَلَدَ آمِنًا وَ اجْنُبْنِىْ وَ بَنِىَّ أَنْ نَعْبُدَ الأَصْنَامَ ، رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِىْ فَإِنَّهُ مِنّى، وَ مَنْ عَصَانِىْ فَإِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (ابراهيم: ۳۴-۳۶)

اور تم کو ہر چیز میں سے بخشا جس کے تم طالب بنے اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو گے تو ان کو شمار نہ کر پاؤ گے بے شک انسان بڑا ہی حق تلف اور ناشکرا ہے، اور یاد کرو جب ابراہیم نے دعا کی کہ اے میرے رب اس سرزمین کو پرامن بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے محفوظ رکھ کہ ہم بتوں کو پوجیں۔ اے میرے رب! ان بتوں نے لوگوں میں سے ایک خلق کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے تو جو میری پیروی کرے وہ تو مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔

حضرت ابراہیم کی یہ دعا اس طرح قبول ہوئی کہ انسان تو انسان اس سرزمین پر کسی جاندار کو ستانا بھی گناہ ٹھیرا، حج کے لیے چار مہینے محترم قرار دیے گئے، کفار قریش کو خانہ کعبہ کی بدولت پورے عرب کی حکمرانی نصیب ہوئی اور شرک سے اجتناب کا یہ طریقہ نکالا کہ اس میں برابر انبیاء

Marfat.com

آتے رہے جنہوں نے شرک و بت پرستی کا استیصال کیا۔

سورۂ مریم میں:

چوں کہ اس سورہ کا عمود توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال ہے اس لیے اس میں انبیاء کے حوالے سے یہ بات کہی گئی ہے کہ ان کی دعوت توحید کی دعوت تھی لیکن ان کے پیرو شرک میں مبتلا ہو گئے، اس لیے یہاں حضرت ابراہیمؑ کے قصے سے مکالمہ کا وہ حصہ نقل کیا گیا جو اس مقصد کے لیے موزوں اور مفید تھا، فرمایا:

واذْكُرْ فِي الْكِتَابِ ابراهيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا، إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا اَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لاَ يَسْمَعُ وَ لاَ يُبْصِرُ وَ لاَ يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا، يَا اَبَتِ إِنِّي قَدْ جَآءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا۔ يَا اَبَتِ لاَ تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ، إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا، يَا اَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِنَ الرَحْمٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا۔ قَالَ أَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ آلِهَتِي يَا ابْرَاهِيمُ لَئِنْ لم تَنْتَهِ لأرجُمَنَّكَ وَ اهْجُرْنِي مَلِيًّا۔

(مریم: ۴۱-۴۶)

اور کتاب میں ابراہیم کی سرگزشت کو یاد کرو بے شک وہ راست باز اور نبی تھا، یاد کرو جب کہ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ اے میرے باپ! آپ ایسی چیزوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں اور نہ وہ کچھ آپ کے کام آنے والی ہیں، اے میرے باپ! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا ہے تو آپ میری پیروی کریں میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا، اے میرے باپ! شیطان کی پرستش نہ کیجیے، شیطان خدائے رحمٰن کا بڑا ہی نافرمان ہے، اے میرے باپ مجھے ڈر ہے کہ آپ کو خدائے رحمٰن کا کوئی عذاب آپکڑے اور آپ شیطان کے ساتھی بن کے رہ جائیں۔

وہ بولا اے ابراہیم! کیا تم میرے معبودوں سے برگشتہ ہو رہے ہو، اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا، تم ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور اور دفع ہو۔

سورہ انبیاء میں:

کفار قریش کو تنبیہ ہے کہ جو دعوت توحید آج رسول تمہیں دے رہے ہیں وہی تمام انبیاء

Marfat.com

نے اپنی قوموں کو دی ہے:

أَمِ اتَّخذُوْا مِنْ دُوْنِهِ آلِهَةً، قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ۔ هَذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لاَ يَعْلَمُوْنَ الحَقَّ فَهُمْ مُعْرِضُوْنَ ۔

(انبیاء : ۲۴)

کیا انہوں نے خدا کے سوا دوسرے معبود ٹھیرا رکھے ہیں؟ ان سے کہو کہ اپنی دلیل پیش کرو، یہ تعلیم ہے ان لوگوں کی جو میرے ساتھ ہیں اور ان لوگوں کی بھی جو مجھ سے پہلے ہوئے بلکہ ان میں سے اکثر حق سے بے خبر ہیں اس وجہ سے اعراض کیے جا رہے ہیں۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم کا وہ عملی کردار سامنے رکھ دیا گیا جو توحید کا کھلا اعلان اور شرک سے واضح برأت اور نفرت کا مظہر ہے۔ فرمایا:

فَجَعَلَهُمْ جُذَاذًا إلاّ كَبِيْرًا لَهُمْ لَعَلَّهُمْ إليه يَرْجِعُوْنَ ۔ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هَذَا بآلِهَتِنَا إنَّهُ لَمِنَ الظَّالِمِيْن۔ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهُ اِبْرَاهِيْم قَالُوْا فَاتُوا بِهِ عَلَى اَعْيُنِ النَاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ۔ قَالُوْا أَأَنْتَ فَعَلْتَ هَذَا بآلِهَتِنَا يَا إبْرَاهِيْمُ، قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيْرُهُمْ، هَذَا فَاسْئَلُوْهُمْ إنْ كَانُوا ينطِقُوْنَ۔ فَرَجَعُوْا إلَى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْا إنَّكُمْ اَنْتُم الظَالِمُوْنَ ۔ (انبیاء: ۵۸-۶۴)

پس اس نے ان (بتوں) کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، بجز ان کے ایک بڑے کے تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں، وہ بولے کہ ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی! بیشک وہ بڑا ہی ظالم ہے، لوگوں نے بتایا کہ ہم نے ایک جوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا جس کو ابراہیم کہتے ہیں، انہوں نے کہا کہ اس کو لوگوں کے سامنے حاضر کرو تاکہ وہ بھی گواہ رہیں انہوں نے پوچھا کہ ابراہیم کیا یہ حرکت ہمارے معبودوں کے ساتھ تم نے کی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ بلکہ ان کے اس بڑے نے یہ حرکت کی ہے تو انہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں، تو ان کو ذرا تنبہ ہوا اور آپس میں بولے کہ بلاشبہ تم ہی ناحق پر ہو۔

اس طرح دیکھیے کہ مختلف مواقع پر قصہ کے جس پہلو کی ضرورت تھی اسے بیان کیا ہے، اور تکرار کا عیب کہیں پیدا نہیں ہونے پایا ہے۔

Marfat.com

۷- قسم

قسم قرآن پاک کا ایک اہم اسلوب ہے جو نہایت اہم مقصد کے لیے قرآن میں استعمال ہوا ہے، عام طور پر لوگوں کو یہ الجھن پیش آتی ہے کہ قرآن میں قسمیں کیوں کھائی گئی ہیں جب کہ قسم فی نفسہ اللہ کی عظمت کے منافی ہے کیوں کہ قسم وہ کھاتا ہے جو اپنی ذات کو حقیر سمجھتا ہے اور جس کو اپنی بات کی صداقت اور اس کی تاثیر پر یقین نہیں ہوتا۔

قرآن میں قسمیں نہایت اہم امور پر کھائی گئی ہیں مثلاً قیامت، توحید، رسالت وغیرہ اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان امور میں قسم کھانا بے سود ہے کیوں کہ اس سے نہ مخالف کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ موافق کو، پھر یہ کہ قسم ایسی چیز کی کھائی جاتی ہے جو عظیم الشان اور بلند مرتبہ ہو۔ پھر غیر اللہ کے لیے قسم کھانا خدا کے لیے کیسے مناسب ہو سکتا ہے؟

لیکن قرآن پر گہری نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ قرآن میں نہایت اہم مقصد کے لیے یہ اسلوب استعمال ہوا ہے اور یہ قرآن کا اپنا ایجاد کردہ اسلوب نہیں ہے بلکہ دور جاہلیت میں یہ اسلوب مستعمل تھا، چناں چہ اوس بن حجر کہتا ہے:

و باللات والعزّی و من دان دینها　　　و باللّٰه أنّ اللّٰه منهنّ اکبرُ (۵۸)

(لات و عزی اور ان کے مذہب اختیار کرنے والوں کی قسم اور خدا کی قسم، اللہ ان سب سے بڑا ہے)

عبید بن الابرص کہتا ہے:

حلفتُ بالله أن الله ذو نعم　　　لمن یشاء و ذو عفو و تصفاح (۵۹)

(میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اللہ جس چیز پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے اور وہ عفو و در گذر کرنے والا ہے)

نابغہ ذبیانی کہتا ہے:

حلفت فلم أترك لنفسك ريبة　　　و ليس وراء الله للمرء مذهب (۶۰)

(میں نے قسم کھائی اور تمہارے لیے کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ چھوڑی اور اللہ کے سوا

Marfat.com

آدمی کے لیے کوئی مذہب نہیں ہے)

عبداللہ بن ذئبہ ذونواس اور حمیر کی شکست اور یمن سے ان کے خروج کے بعد کہتا ہے:

لعمرك ما للفتى من مفر مع الموت يلحقه والكبر
لعمرك ما للفتى صحوة لعمرك ما أن له وزرٌ (٦١)

(بخدا موت اور کمزوری و ضعیفی سے کسی نوجوان کو چھٹکارا نہیں ہے، بخدا ان میں سے کوئی مصائب سے نجات حاصل نہیں کر سکتا بخدا ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے)

قسم کا مقصد:

قرآن میں قسم اس لیے کھائی گئی ہے تاکہ مقسم علیہ کی تاکید ہو سکے اور مخاطب کے شک و شبہ کو دور کیا جا سکے۔(٦٢)

ابن سیدہ کہتے ہیں کہ "ایک شخص قسم اس لیے کھاتا ہے تاکہ وہ جس بات کی خبر دے رہا ہے اس کو مؤکد بنا سکے، اور یہ ایک جملہ ہے جس کے ذریعے دوسرے جملہ کی تاکید مقصود ہوتی ہے"(٦٣)

سیبویہ کے یہاں بھی قسم کا یہی مفہوم ہے وہ کہتا ہے کہ "یاد رکھو قسم تمہاری گفتگو کو مؤکد بنانے کے لیے ہے۔(٦٤)

علامہ ابن قیمؒ بھی اسی خیال کا اظہار یوں کرتے ہیں "قسم کا مقصد خبر کی تحقیق و تاکید ہے۔"(٦٥)

سورۂ طارق کی قسم کی بابت لکھتے ہیں کہ "اللہ نے آسمان اور اس کے روشن ستاروں کی قسم کھائی اور ان میں سے ہر ایک اس کی توحید کی نشانیوں میں سے ہے۔"(٦٦)

اس سورہ کے وسط کی قسم کی بابت فرماتے ہیں کہ "اللہ نے بارش والے آسمان اور نباتات سے معمور زمین کی قسم کھائی اور ان میں سے ہر ایک اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے جو اس کی پروردگاری پر دلیل ہے۔"(٦٧)

سورۂ بروج کے قسموں کی بابت لکھتے ہیں کہ "یہ سب اللہ کی قدرت کی نشانیاں اور اس کی وحدانیت کے دلائل ہیں۔"(٦٨)

سورۂ انشقاق کے آخر میں قسم کی بابت فرماتے ہیں کہ "یہ (یعنی شفق، لیل اور قمر) اور اس طرح کی تمام چیزیں نشانیاں ہیں جو خدا کی ربوبیت پر دلیل ہیں اور اس کی صفات کمال کے علم کو مستلزم ہیں۔"(٦٩)

Marfat.com

امام رازیؒ نے قسم کے سلسلے میں مختلف باتیں کہی ہیں اور مختلف پہلوؤں سے قسم کی حکمت اور مقصد سمجھانے کی کوشش کی ہے، ایک قول ان کا یہ ہے کہ قسمیں استدلال کے لیے نہیں ہوتیں بلکہ سابقہ دلائل کی تاکید کے لیے ہوتی ہیں، قسموں سے پہلے چوں کہ دلائل بیان ہو چکے ہوتے ہیں اس لیے اصل اعتماد ان دلائل پر ہوتا ہے نہ کہ قسموں پر۔ مثال کے طور پر سورۂ والصافات کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے دوسری سورتوں میں نہایت یقینی دلائل سے توحید، بعث اور قیامت کو ثابت کر دیا ہے، چونکہ یہ دلائل گزر چکے ہیں اور ان کا بیان ابھی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا ہے، اس لیے دلائل سے قطع نظر کر کے بطور تاکید قسم کا ذکر کیا۔''(۷۰)

دوسرا قول یہ ہے کہ ''اس کلام سے مقصود بت پرستوں کے اس قول کی تردید ہے کہ یہ بت خدا ہیں، پس اس کی تردید میں گویا یوں کہا گیا کہ یہ مذہب اپنی رکاکت اور لغویت کے اعتبار سے ایسا ناقابل توجہ ہے کہ اس کی تردید کے لیے بس اسی طرح کی دلیل کافی ہے۔''

ان کے جواب کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ ''عرب جھوٹی قسموں سے پرہیز کرتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ جھوٹی قسمیں مصیبت لاتی اور آبادیوں کو ویرانوں میں تبدیل کر دیتی ہیں، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت ہی اعلیٰ و اشرف چیزوں کی قسمیں کھائیں اور آپ کی بلندی و استحکام میں اضافہ ہی ہوتا گیا، اس سے ان پر یہ بات منکشف ہوئی کہ آپ کی قسمیں جھوٹی نہیں ہیں ورنہ آپ ان کی آفتوں اور تباہ کاریوں سے کبھی نہیں بچ سکتے تھے۔''

چوتھا قول یہ ہے کہ ''تمام قسمیں جو اللہ نے کھائی ہیں وہ دراصل دلائل ہیں جو قسموں کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں''

ان کا پانچواں قول یہ ہے کہ ''قسم کا مقصد مقسم بہ کی عظمت و جلالت قدر کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے۔''(۷۱)

زرکشی اور سیوطی کا بھی یہی قول ہے کہ ''قسم کا مقصد خبر کی تحقیق و تاکید ہے۔ ان حضرات کے نزدیک '' والله يشهد إن المنافقين لكاذبون'' (منافقین:۱)) جیسی آیات بھی قسم پر مشتمل ہیں، گرچہ ان میں گواہی دینے کی خبر ہے، ان کے نزدیک چوں کہ یہاں خبر کی تاکید کے لیے شہادت کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس لیے اسے بھی قسم قرار دیا ہے۔(۷۲)

علامہ ابوالقاسم القشیری کہتے ہیں کہ اللہ نے کمال حجت و تاکید کے لیے قسم کا تذکرہ کیا ہے

Marfat.com

کیوں کہ فیصلہ دو چیزوں کی بنیاد پر کیا جاتا ہے یا تو گواہی موجود ہو یا قسم کھالی جائے، اور اللہ نے اپنی کتاب میں دونوں ہی طریقوں کا تذکرہ کر دیا ہے۔ فرمایا:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّه لاَ إِلَهَ اِلاَّ هُوَ وَالمَلاَئِكَةُ و أُولُوا العِلمِ قَائِمًا بِالْقِسطِ لاَ إِلَهَ إلاّ هُوَ الْعَزِيزُ الحَكِيمُ (آل عمران: ۱۸)

اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور فرشتے اور سب اہل علم بھی راستی اور انصاف کے ساتھ اس پر گواہ ہیں کہ اس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی خدا نہیں ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

قُل إِیْ وَ رَبِّی اِنَّهَ لَحَقٌّ (یونس:۵۳) (۷۳)

کہو میرے رب کی قسم یہ بالکل سچ ہے۔

علامہ فراہیؒ نے دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی قسمیں آئی ہیں، استدلال و استشہاد کے لیے آئی ہیں، وہ دراصل فطری دلیلیں اور تاریخی شہادتیں ہیں جو قسموں کی صورت میں پیش کی گئی ہیں، اور استدلال و استشہاد کا یہ اسلوب محض تنوع کی خاطر نہیں اپنایا گیا بلکہ اس میں بڑی بلاغتیں اور گوناگوں حکمتیں ہوتی ہیں۔ علامہ فراہیؒ نے اپنے اس نظریے کی تائید میں کلام عرب سے بھی استدلال کیا ہے، مثال کے طور پر ابو العریان طائی حاتم کی مدح میں کہتا ہے:

قد علموا والقدور تعلمه و مستهل الفرور مطردٌ
إن ليس عند اعترار طارقها لديك إلا استلالها صددٌ (۷۴)

(لوگ جانتے ہیں اور دیگیں گواہ ہیں اور پیہم چلنے والی چمکدار چھریاں کہ زمانۂ قحط میں شب میں آنے والے کی میزبانی میں تیری طرف سے صرف اتنی تاخیر ہوتی ہے جتنی دیر میں (کسی جانور کو ذبح کرنے کے لیے) تو اپنی تلوار کھینچ سکے۔

راعی کے اشعار ہیں:

إن السماءَ و إن الريحَ شاهدة والأرض تشهد والأيام والبلد
لقد جريت بنى بدر ببغيتها يومَ الهباءَة يوماً ماله قَود (۷۵)

(آسمان اور ہوا شاہد ہیں، زمین شاہد ہے، جنگیں شاہد ہیں اور سر زمین شاہد ہے کہ میں نے

Marfat.com

بنی بدر کو ہباءۃ کی لڑائی میں ان کی سرکشی کا ایسا مزہ چکھایا، جس کا بدلہ ممکن نہیں ہے۔)

دوسری جگہ کہتا ہے:

والخیل تعلم أنا فی تجاولنا عند الطعان أو لو بؤسی و أنعام (۷۶)

(گھوڑے جانتے ہیں (گواہ ہیں) کہ ہم نیزہ بازی میں جولانی کے وقت کسی کے لیے تازیانۂ عذاب ہیں اور کسی کے لیے رحمت)

علامہ فراہیؒ نے اپنے عوئی کی تائید میں فضل بن عیسٰی بن ابان کا یہ وعظ بھی پیش کیا ہے:

سل الأرض فقل من شق أنهارك و غرس أشجارك و خبی ثمارك فإن لم تجبك حوارًا إجابتك اِعتبارًا۔

(زمین سے پوچھو تیری نہریں کس نے جاری کیں؟ تیرے درخت کس نے لگائے؟ تیرے پھل کس نے چنے؟ اگر زبان قال سے جواب نہ دے سکے گی تو زبان حال سے ضرور جواب دے گی)(۷۷)

قرآن پاک سے مثالیں:

سورۂ فجر میں آفاق کی بعض نشانیوں کی قسم کھائی گئی ہے جو درحقیقت اس بات پر شاہد ہیں کہ اس کائنات کی ہر چیز کی باگ اس کے خالق کے ہاتھ میں ہے، وہی جس حد تک چاہتا ہے اس کو ڈھیل دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے اس کو روک لیتا ہے، مجال نہیں کہ کوئی شئ اس کی مقرر کی ہوئی حد سے آگے بڑھ سکے یا پیچھے ہٹ سکے۔ فرمایا:

وَالفَجرِ وَ لَیَالٍ عَشرٍ وَالشَّفعِ وَالوَترِ واللَّیلِ إِذَا یَسر، هَلَ فِی ذَٰلِكَ قَسَمٌ لِذِیْ حِجْر۔ (فجر: ۱-۵)

شاہد ہے فجر اور دس راتیں اور جفت و طاق، جب وہ چل کھڑی ہو، کیوں کہ ان میں تو ہے ایک عاقل کے لیے عظیم شہادت!

سورۂ مرسلات میں ہواؤں کے تصرفات کی شہادت اس بات پر پیش کی گئی ہے کہ لوگوں کو جس عذاب سے ڈرایا جارہا ہے وہ کوئی انہونی بات نہیں ہے، اللہ نے جب چاہا اپنی ہواؤں اور بادلوں کے ذریعے ہی سے پچھلی قوموں کو یہ کرشمہ دکھایا ہے اور جب چاہے گا قریش کو بھی یہ کرشمہ دکھادے گا اگر وہ سلامتی اور امن چاہتے ہیں تو خدا کی رحمت اور اس کی نعمت کے جو آثار ان کے آگے پیچھے

Marfat.com

موجود ہیں، ان سے سبق حاصل کریں، خود اس کو اپنے لیے دعوت دینے کی جسارت نہ کریں فرمایا:

وَالْمُرْسَلَاتِ عُرُفًا فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا وَ النّٰشِرَاتِ نَشْرًا فَالْفَارِقَاتِ فَرْقًا فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا عُذْرًا أَوْ نُذْرًا إِنَّما تُوعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۔ (مرسلات: ۱-۷)

شاہد ہیں ہوائیں جن کی باگ چھوڑ دی جاتی ہے پس وہ اڑاتی ہیں غبار اندھا دھند اور شاہد ہیں ہوائیں پھیلانے والی (بادلوں) کی، پھر وہ معاملہ کرتی ہیں جدا جدا پھر ڈالتی رہتی ہیں یاد دہانی اتمام حجت کے طور پر یا آگاہ کر دینے کو بے شک جو وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے، وہ شدنی ہے۔

سورۂ والتین میں جبل تین، جبل زیتون، طور سینا اور مکہ مکرمہ کی شہادت اس بات پر پیش کی گئی ہے کہ اللہ نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے لیکن اس کی سنت یہ ہے کہ جو لوگ اس انعام کی قدر کرتے ہیں، فطرت صالحہ کو نشو و نما دیتے ہیں اور انبیاء کی دعوت قبول کر کے ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کو تو ہم دائمی اجر سے نوازتے ہیں، لیکن جو لوگ اس نعمت کی ناقدری کرتے ہیں اور ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار نہیں کرتے اس کو ہم اس گڑھے میں پھینک دیتے ہیں جس سے بچانے کے لیے ہی ہم نے ان پر یہ انعام کیا تھا۔ فرمایا:

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْن وَ طُوْرِ سِيْنِيْنَ وَ هٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِيْن۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيْم، ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِيْن، إِلاَّ الَّذِيْنَ آمَنُوا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ، فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْن فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ، أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِيْن۔ (تین)

شاہد ہیں جبل تین اور کوہ زیتون اور طور اور یہ پرامن سرزمین کہ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا، پھر ہم نے اس کو ادنیٰ درجہ میں ڈال دیا جب کہ وہ خود گرنے والا بنا بجز ان کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے، سو ان کے لیے ایک دائمی صلہ ہے، تو اب کیا ہے جس سے تم جزا و سزا کو جھٹلاتے ہو! کیا اللہ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں۔

سورۂ عادیات میں یہ حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ انسان بڑا ناشکرا ہے، وہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے، اس کی بخشی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر طرح طرح کے فوائد سمیٹتا ہے، لیکن وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ خدا کے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں ان کو ادا کرنا بھی واجب ہے اور اس سے آگے بڑھ کر خدا کی بخشی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کو

Marfat.com

اسی کے خلاف استعمال کرنے لگتا ہے۔اور اس بات کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتا کہ ایک دن جزا اور محاسبہ کا آنے والا ہے، جب سینوں کے راز تک اگلوا لیے جائیں گے، اس حقیقت پر استدلال جنگی گھوڑوں کے ذریعہ بطریق قسم کیا گیا ہے جو وفاداری اور جاں نثاری میں بے مثل ہوتے ہیں۔ فرمایا:

وَالعٰدِيَاتِ ضَبْحًا، فالمُورِيٰتِ قَدْحًا فَالمُغِيرَاتِ صُبْحًا فأَثَرْنَ بِهِ نَقْعًا فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعًا إِنَّ الإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُود۔ (عادیات: ۱-۶)

گواہی دیتے ہیں ہانپتے، دوڑنے والے گھوڑے ٹاپوں کی ٹھوکر سے چنگاریاں نکالنے والے، صبح کے وقت دھاوا کرنے والے، دوڑ سے غبار اٹھانے والے اور غبار کے ساتھ غول میں گھس جانے والے کہ انسان اپنے رب کا نہایت ناشکرا ہے۔

سورۂ یٰسین میں قرآن حکیم کو رسول اللہ کی رسالت کے اثبات میں بطور شہادت پیش کیا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور لوگوں کو صراط مستقیم کی دعوت دے رہے ہیں، یہ قرآن ان لوگوں پر ایک عظیم احسان ہے جواب تک خدا کی تعلیم وہدایت سے بالکل محروم ضلالت میں بھٹک رہے تھے، یہ خود ان کی بدقسمتی ہے کہ استکبار کے سبب سے اس کو جھٹلا رہے ہیں۔ فرمایا:

يٰسٓ۔ وَالقُرآنِ الحَكِيم إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِين عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيم، تَنْزِيلَ العَزِيزِ الرَحِيم۔ (یس : ۱-۵)

یہ سورۂ یٰسٓ ہے، شاہد ہے پر حکمت قرآن کہ تم رسولوں میں سے ہو، ایک نہایت سیدھی راہ پر جس کو نہایت اہتمام سے اتارا ہے خدائے عزیز ورحیم نے۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ قرآن پاک میں صرف خدائے عزوجل ہی کی قسم نہیں کھائی گئی ہے بلکہ قرآن کریم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فرشتوں، یوم قیامت، آیات الٰہی، زمانوں اور مقدس مقامات وغیرہ کی بھی قسم کھائی گئی ہے اور انہیں بطور استدلال پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ یونس میں خدائے عزوجل کی قسم کھائی گئی ہے:

وَ يَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقٌّ هُوَ قُلْ اِیْ وَ رَبِّی إِنَّه لَحَقٌّ وَ مَا انتم بِمُعْجِزِيْن۔ (یونس: ۵۳)

پھر پوچھتے ہیں کیا واقعی یہ سچ ہے جو تم کہہ رہے ہو؟ کہو "میرے رب کی قسم، یہ بالکل سچ ہے اور تم اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اسے ظہور میں آنے سے روک سکو۔

Marfat.com

اس طرح قرآن میں دس مقامات پر اللہ تعالی نے اپنی مقدس ذات یا اپنی صفات علیا کی قسم کھائی ہے، قرآن نے رسول پاک کی حیات اور عمر کی قسم بھی کھائی ہے اور مقصد اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت جتانا ہے، کیوں کہ آپ کے علاوہ کسی اور کی زندگی کی قسم نہیں کھائی گئی، (۷۸) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ (حجر: ۷۲)

تیری جان کی قسم! اے نبیؐ اس وقت ان پر ایک نشہ سا چڑھا ہوا تھا جس میں وہ آپے سے باہر ہوئے جاتے تھے۔ (۷۹)

اللہ نے قرآن پاک کی بھی قسم کھائی ہے اور یہ قسم چھ مواقع پر موجود ہے، تین جگہ لفظ ''القرآن'' کی قسم کھائی گئی ہے جب کہ بقیہ تین جگہ مقسم بہ لفظ الکتاب ہے، فرمایا:

صٓ ۔ وَالقُرآنِ ذِی الذِّكْرِ (ص: ۱) صٓ قسم ہے نصیحت بھرے قرآن کی۔

سورۂ زخرف میں ہے:

حٰمٓ۔ وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ۔ (حٰمٓ:۱-۳)

حٰمٓ۔ قسم ہے اس واضح کتاب کی کہ ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے، تاکہ تم لوگ اسے سمجھو۔ (۸۰)

فرشتوں کو بھی بطور شہادت قسمیہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، فرمایا:

وَالصَّافَّاتِ صَفًّا، فَالزَاجِرَاتِ زَجْرًا فَالتَّالِيَاتِ ذِكْرًا، إِنَّ إِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ۔ (الصافات: ۱-۴)

قطار در قطار صف باندھنے والوں کی قسم، پھر ان کی قسم جو ڈانٹ پھٹکار کرنے والے ہیں، پھر ان کی قسم جو کلام نصیحت سنانے والے ہیں، تمہارا معبود حقیقی بس ایک ہی ہے۔

سورۂ قیامت میں قیامت کی قسم کھائی گئی ہے، اسی طرح سورۂ بروج میں بھی قیامت کی قسم کھائی گئی ہے۔ فرمایا:

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ۔ (بروج: ۲) اور قسم ہے اس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

سورۂ مدثر ۳۳، ۳۴، سورۂ تکویر ۱۷، ۱۸، انشقاق: ۱۷، فجر: ۱، ۴ وغیرہ مختلف آیات میں زمانوں کی قسم کھائی گئی ہے، اسی طرح سورۂ طور میں، سورۃ تین میں، سورۂ بلد میں، اور دوسری

Marfat.com

آیات میں مقدس مقامات کی قسم کھائی گئی ہے، آیات الٰہی تو بے شمار آیات میں مقسم بہ کی حیثیت سے موجود ہیں۔

مقسم علیہ کی مختلف شکلیں

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بنیادی طور پر توحید، رسالت اور آخرت کے اثبات کے لیے قسمیں کھائی ہیں لیکن اگر ساری قسموں کا احاطہ کیا جائے تو وہ پانچ امور میں مخصوص نظر آتی ہیں:

۱- توحید:

مشرکین مکہ شرک میں لت پت تھے، انھوں نے متعدد معبودان باطل کو خدا کی ذات و صفات میں شریک کر رکھا تھا، اس لیے دلائل کے ذریعہ سب سے پہلے عقیدے پر ضرب لگائی گئی اور توحید خالص کا نظریہ ان کے سامنے پیش کیا گیا، کہیں سیدھے سادھے انداز میں دلائل کے ذریعہ انہیں توحید کی تعلیم دی گئی اور فرمایا گیا:

وَ قَالَ اللّٰهُ لاَ تَتَّخِذُوا إِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ إِنَّمَا هُوَ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَإِيَّايَ فَارْهَبُونَ، وَ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ وَ لَهُ الدِّيْنُ وَاجِبًا أَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُونَ۔ و مَابِكُمْ مِنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْأَرُونَ۔ (نحل: ۵۱-۵۳)

اللہ کا فرمان ہے کہ "دو خدا نہ بنالو، خدا تو بس ایک ہی ہے لہٰذا تم مجھ ہی سے ڈرو اسی کا ہے وہ سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور خالصا اسی کا دین (ساری کائنات میں) چل رہا ہے، پھر کیا اللہ کو چھوڑ کر تم کسی اور سے تقوی کرو گے، تم کو جو نعمت بھی حاصل ہے اللہ ہی کی طرف سے ہے، پھر جب کوئی سخت وقت تم پر آتا ہے تو تم لوگ خود اپنی فریادیں لے کر اسی کی طرف دوڑتے ہو۔

اسی مقصد کے لیے قرآن نے قسم کا اسلوب بھی اختیار کیا ہے تاکہ ترہیب و تاکید میں اضافہ ہو سکے، فرمایا:

وَالصّٰفّٰتِ صَفًّا، فَالزّٰجِرَاتِ زَجْرًا فَالتّٰلِيَاتِ ذِكْرًا۔ إِنَّ إِلٰهَكُم

Marfat.com

لَوَاحِدٌ رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ وَ مَابَيْنَهُمَا وَ رَبُّ المَشَارِقِ۔
(صافات: ۱-۵)

قطار در قطار صف باندھنے والوں کی قسم، پھران کی قسم جوڈانٹنے اور پھٹکارنے والے ہیں، پھران کی قسم جو کلام نصیحت سنانے والے ہیں، تمہارا معبود حقیقی بس ایک ہی ہے، وہ جو زمینوں اور آسمانوں کا اور تمام ان چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں اور سارے مشرقوں کا مالک۔

۲- اثبات رسالت:

قرآن پاک میں ایسی آیات بے شمار ہیں جو نبوت محمدی کی تصدیق کے لیے دلائل فراہم کرتی ہیں، قسم کے ذریعے بھی رسول پاک ﷺ کی تصدیق کی گئی ہے۔ سورۂ نجم میں ہے:

وَ النَّجْمِ إِذَا هَوىٰ مَاضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَ مَا غَوىٰ وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوىٰ إِنْ هُوَ إِلاَّ وَحْيٌ يُّوحٰى (نجم: ۱-۴)

قسم ہے تارے کی جب کہ وہ غروب ہوا، تمہارا رفیق نہ بھٹکا ہے نہ بہکا ہے، وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا، یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔

یعنی اے کفار قریش یہ قرآن جو تم کو سنایا جارہا ہے یہ تمہارے کاہنوں اور نجومیوں کی قسم کا کوئی کلام نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب و معتمد فرشتے کے ذریعے سے اپنے پیغمبر پر اسے وحی فرمایا ہے، اس میں کسی ضلالت و گمرہی کا کوئی شائبہ نہیں ہے، اس لیے تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ اس پیغمبر کی دعوت پر ایمان لے آؤ۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

وَالضُّحٰى وَاللَّيْلِ إِذَا سَجٰى مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَاقَلٰى (الضحی:۱-۳)

شاہد ہے وقت چاشت اور شاہد ہے رات جب پر سکون ہو جاتی ہے کہ تیرے خداوند نے نہ تجھے چھوڑا اور نہ تجھ سے بے زار ہوا۔

یہاں قسمیہ اسلوب کے ذریعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دی ہے کہ اس وقت آپ جس امتحان سے گذر رہے ہیں وہ خدا کی کسی بے التفاتی یا عتاب کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ درحقیقت اس

Marfat.com

امتحان کا ایک حصہ ہے جو انسان کی روحانی و اخلاقی تربیت کے لیے ضروری ہے۔ اگر اس وقت تم مخالفوں کی مخالفت، انصار و اعوان کی قلت اور اسباب و وسائل کی کمی سے دوچار ہو یا آسمانی و روحانی کمک کے پہنچنے میں بظاہر تاخیر ہو رہی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمہارے رب نے تمہیں چھوڑ دیا ہے یا تم سے بے زار ہو گیا ہے۔ بلکہ یہ تمہاری تربیت کے لیے تمہارا امتحان ہے۔ (۸۱)

۳- قرآن کی حقانیت پر دلیل:

قرآن نے خود اپنی حقانیت پر دلیل فراہم کی ہے اور تاکید کے لیے اس کی قسم کھائی ہے۔ فرمایا:

فَلَا أُقسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ وَ إِنَّهُ لَقَسَمٌ لَّو تَعلَمُونَ عَظِيمٌ إِنَّهُ لَقُرآنٌ كَرِيمٌ۔ (واقعہ: ۷۵-۷۷)

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے گرنے کے ٹھکانوں کی! اور بے شک یہ ایک بہت بڑی قسم ہے اگر تم جانو! بے شک یہ ایک باعزت قرآن ہے۔

یہاں شیاطین کی کمین گاہوں پر حملے کا جو انتظام اللہ نے کیا ہے، اس کا حوالہ دے کر مخاطبوں کو اللہ نے یہ تنبہ فرمایا ہے کہ اس قرآن کو کاہنوں کی قسم کا کوئی شیطانی القاء گمان نہ کرو، بلکہ یہ ایک نہایت باعزت اور برتر کلام ہے جو اللہ کے پاس ایک محفوظ کتاب میں موجود ہے، جس تک اس کے پاک فرشتوں کے سوا کسی کی بھی رسائی نہیں ہو سکتی، سورۂ دخان میں کتاب مبین کی قسم کھا کر اس امر کی دلیل مہیا کرنا مطلوب ہے کہ اس کتاب کو ہنسی کھیل یا کسی مجذوب کی بڑ نہ سمجھیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم اسکیم کا نہایت عظیم حصہ ہے اور اس کو اتارنے کے لیے اس نے وہ مبارک شب منتخب فرمائی جو اس کی طرف سے تمام امور حکمت کی تقسیم کے لیے خاص ہے، یعنی قرآن کی صداقت کے لیے کسی خارجی دلیل کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ کتاب خود بہت بڑی دلیل ہے۔ فرمایا:

حٰمٓ وَالكِتَابِ المُبِينِ إِنَّا أَنزَلنَاهُ فِي لَيلَةٍ مُّبَارَكَةٍ، إِنَّا كُنَا مُنذِرِينَ۔

(دخان: ۱-۳)

یہ حٰمٓ ہے، قسم ہے واضح کر دینے والی کتاب کی بے شک ہم نے اس کو ایک مبارک رات میں اتارا ہے۔ بے شک ہم لوگوں کو آگاہ کر دینے والے تھے۔

Marfat.com

۴- آخرت کی دلیل:

قرآن پاک میں قسمیہ اسلوب کے ذریعہ متعدد بار، آخرت، بعث بعد الموت اور حشر وغیرہ پر دلائل دیے گئے ہیں، چند آیات ملاحظہ ہوں:

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا أَنْ لَّنْ يُّبعَثُوا قُلْ بَلٰى وَ رَبِّىْ لَتُبعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُم، وَ ذَلِكَ عَلَى اللّٰه يَسِيرٌ۔ (تغابن:۷)

جن لوگوں نے کفر کیا انھوں نے دعویٰ کیا کہ وہ ہرگز مرنے کے بعد نہیں اٹھائے جانے کے۔ کہہ دو! ہاں میرے رب کی قسم! تم ضرور اٹھائے جاؤ گے پھر تم کو بتایا جائے گا جو کچھ تم نے کیا ہوگا اور یہ کام اللہ کے لیے نہایت آسان ہے۔

سورۂ مریم میں فرمایا:

فَوَ رَبِّكَ لَنَحشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ ثُمَّ لَنُحضِرَنَّهُمْ حَولَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا۔ (مریم:۶۸)

تیرے رب کی قسم ہم ضرور ان سب کو اور ان کے ساتھ شیاطین کو بھی گھیر لائیں گے، پھر جہنم کے گرد لا کر ان کو گھٹنوں کے بل گرا دیں گے۔

۵- انسانوں کی ناشکری پر دلیل:

قرآن پاک میں انسان کی ناشکری و نافرمانی پر قسمیہ انداز میں استشہاد کیا گیا ہے اور اسے تنبیہ و ملامت کی گئی ہے، فرمایا:

وَالعٰدِيٰتِ ضبحًا فَالمُورِيٰتِ قَدحًا فَالمُغِيرَاتِ صُبحًا فَأَثَرنَ بِهِ نَقعًا فَوَسَطنَ بِهِ جَمعًا إِنَّ الإِنسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُود۔ (عادیات: ۱-۶)

گواہی دیتے ہیں ہانپنے، دوڑنے والے گھوڑے ٹاپوں کی ٹھوکر سے چنگاریاں نکالنے والے، صبح کے وقت دھاوا کرنے والے، دوڑ سے غبار اٹھانے والے، اور غبار کے ساتھ غول میں گھس جانے والے کہ انسان اپنے رب کا نہایت ناشکرا ہے۔

۶- تحکیم رسول پر دلیل:

قرآن نے اس امر کی بھی قسم کھائی ہے کہ رسول کی حیثیت ایک واجب الاطاعت ہادی کی

Marfat.com

ہے، اللہ تعالیٰ اپنے اذن کے تحت اس کو اس لیے مامور فرماتا ہے کہ لوگ جملہ معاملات میں اسی کے احکام کی اطاعت کریں اور اسے خدا کی حاکمیتِ قانونی و تشریعی کا مظہر سمجھیں۔ فرمایا:

فَلاَ وَ رَبِّكَ لاَ يُؤمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لاَ يَجِدُوْا فِيْ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوا تَسْلِيْمًا۔ (نساء: ۶۵)

پس نہیں تیرے رب کی قسم، یہ لوگ مومن نہیں ہیں جب تک اپنی نزاعات میں تمہیں اپنا حکم نہ مانیں اور جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس کیے بغیر اس کے آگے سر تسلیم خم نہ کر دیں۔

قسم کی بلاغتیں:

فن بلاغت پر مشتمل کتابوں میں قسم کی ادبی لطافتوں اور فوائد پر کچھ زیادہ مواد نہیں ملتا، علامہ عزالدین بن عبدالسلام نے بعض قرآنی آیات میں قسم اور جواب قسم کی محذوفات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (۸۲) البتہ مولانا فراہیؒ نے اس پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی ہے، انہوں نے قسم کے بعض فوائد پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

۱۔ قسم کا یہ اسلوب قول کی پختگی اور تاکید پر دلالت کرتا ہے، چناں چہ قرآن پاک میں رسولوں کا یہ قول مذکور ہے:

قالوا رَبُّنَا يَعْلَمُ إِنَّا إِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْن وَ مَا عَلَيْنَا إِلاَّ الْبَلاغ الْمُبِيْن۔

(یٰسٓ: ۱۶-۱۷)

ان لوگوں نے کہا ہمارا پروردگار شاہد ہے کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں اور نہیں ہے ہماری ذمہ داری مگر کھلے طور پر پہونچا دینا۔

سورۂ طارق میں ہے:

والسماءِ ذَاتِ الرَجْعِ والأَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ إِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَ مَا هُوَ بالهَزْل۔ (۱۱-۱۴)

شاہد ہے آسمانِ پرنگار اور زمین پر شگاف کہ یہ دوٹوک بات ہے اور ہنسی مسخری نہیں ہے۔

۲۔ چونکہ یہ انشاء کی صورت میں ہوتا ہے اس لیے مخاطب کے لیے تردید و انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ وہ جواب قسم کا آسانی سے انکار کر سکتا ہے کیونکہ وہ خبر کی صورت میں ہوتا

Marfat.com

ہے لیکن نفس قسم کاانکار نہیں کر سکتا، کیوں کہ وہ انشاء کی شکل میں آتی ہے۔

۳۔ استدلال کے لیے یہی اسلوب زیادہ موزوں ہے کیوں کہ اس میں اختصار ہوتا ہے اور جب الفاظ کم ہوں تو مفہوم تمام حجابات سے مجرد ہو کر سہولت سے سامنے آجاتا ہے اور اس سے اس کی تاثیر اور زور میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استعارہ کبھی کبھی بلاغت میں تشبیہ پر فوقیت لے جاتا ہے۔

۴۔ اسلوب کی چوتھی خوبی یہ ہے کہ اس میں دلیل کے ڈھونڈنے میں سامع خود متکلم کے ساتھ شریک ہوتا ہے جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر عناد و اختلاف کا داعیہ کمزور پڑ جاتا ہے۔

۵۔ اس اسلوب میں دلیل اپنی معروف صورت سے ایک بالکل مختلف صورت میں سامنے آتی ہے جس کے سبب سے منکر کو مناظرہ کرنے اور جھگڑنے کی راہ نہیں ملتی۔

۶۔ جن سورتوں کے شروع میں قسمیں پائی جاتی ہیں، اہل ذوق جانتے ہیں کہ ان قسموں نے ان کو حسن و خوبی کا ایک عنوان جمال بخش دیا ہے، سورتوں کے اوائل میں یہ قسمیں اس طرح چمکتی ہیں جس طرح انگشتری میں نگینہ۔ بعض جگہ سورتوں کے بیچ میں بھی قسمیں آئی ہیں لیکن کم، مگر جہاں کہیں آئی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مطلع قصیدے کے بیچ میں آگیا ہو۔

۷۔ اس اسلوب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں دلیل دعوی سے پہلے سامنے آجاتی ہے جس کا فائدہ یہ ہے کہ یہ دلیل آہستہ آہستہ مخاطب کو اصل دعوی تک کھینچ لاتی ہے، اس کے برعکس اگر مخاطب پہلے ہی سے اصل دعویٰ کو سمجھ جائے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ کترا کر دوسری راہ اختیار کر لے۔

۸۔ قسم، کلام کی اس قسم میں سے ہے جس کو جوامع الکلم کہتے ہیں یعنی بظاہر تو وہ ایک مختصر سی بات ہوتی ہے لیکن اس کے اندر معانی کا ایک دفتر پوشیدہ ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مقسم بہ کے ساتھ استدلال کا پہلو مذکور نہیں ہوتا۔ اگر اس میں استدلال کے کسی خاص پہلو کی طرف اشارہ کر دیا جائے تب تو اس سے صرف ایک ہی دلیل پیدا ہوگی لیکن جب یہ صورت نہ ہو بلکہ استدلال کے پہلو کو غیر معین چھوڑ دیا جائے تو ایک ہی چیز کے اندر متعدد معانی اور گوناگوں پہلو استدلال و استنباط کے ہو سکتے ہیں اور ایک غور کرنے والی عقل اس کے اندر بے شمار دلیلیں نکال سکتی ہے۔(۸۳)

یہاں قرآن پاک کی قسموں پر مفصل بحث مقصود نہیں ہے بلکہ صرف ایک اسلوب کی حیثیت سے اس پر مجمل گفتگو کی گئی ہے۔

Marfat.com

۸- تخاطب

قرآن کے اسلوب تخاطب کا سمجھنا قرآن فہمی کے لیے ناگزیر ہے کیوں کہ جہت خطاب کی تبدیلی اوراس کے عموم وخصوص سے بڑی تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں اوراس صورت میں قرآن کا فہم اوراس کی معرفت دشوار ہو جاتی ہے۔

قرآن میں جب خطاب واحد سے ہوتا ہے اور وہاں کوئی صریح اور واضح قرینہ موجود نہیں ہوتا تو عام مفسرین فوراً یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب ہیں، حالاں کہ ایسے موقعوں پر خطاب کی دو صورتیں ہوتی ہیں:

ا۔ پہلی صورت مخاطب واحد کی یہ ہے کہ نبی چوں کہ امت کا امام، عوام کا قائد اور قافلۂ انسانیت کا رہبر ہوتا ہے، اس لیے اسے مخاطب بنایا جاتا ہے ورنہ اصل روئے سخن عوام کی جانب ہوتا ہے، اس طرح یہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے تمام لوگوں سے ہوتا ہے۔

سورۂ توبہ میں ہے:

وَ إِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَ إِنْ تُصِبْكَ مُصِيبَةٌ يَقُوْلُوا قَدْ أَخَذْنَا أَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ۔ (توبہ: ۵۰)

تمہارا بھلا ہوتا ہے تو انہیں رنج ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ منہ پھیر کر خوش خوش ملتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ اچھا ہوا ہم نے پہلے اپنی معاملہ ٹھیک کرلیا تھا۔

یہاں تُصِبْكَ میں خطاب واحد ہے اور بظاہر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا گیا ہے لیکن مراد عام مومنین ہیں چناں چہ آگے کی آیت میں اس کی وضاحت ہوگئی ہے۔ فرمایا:

قُلْ لَنْ يُّصِيْبَنَا إِلاَّ مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا وَ هُوَ مَوْلاَنَا وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُومِنُون۔ (توبہ: ۵۱)

ان سے کہو ہمیں ہرگز کوئی بھلائی یا برائی نہیں پہونچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے، اللہ ہی ہمارا مولیٰ ہے اور اہل ایمان کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

Marfat.com

یعنی اہل ایمان کے لیے مصیبت اور راحت، دکھ اور سکھ، موت اور زندگی دونوں ہی میں خیر ہے ایک سے مومن کو صبر، کمزوریوں کی اصلاح اور توبہ وانابت کی تربیت ملتی ہے اور دوسری سے شکر نعمت، ادائے حقوق اور احسان کی ترغیب و تشویق ہوتی ہے، یہ وہ جواب ہے جو مومنین کی طرف سے اوپر والی بات کا دیا گیا ہے، یہاں جواب میں جمع کا صیغہ (یُصیبنا، لنا ، مولانا) اس امر کی دلیل ہے کہ اوپر والی آیت میں گرچہ خطاب نبیؐ سے ہے لیکن مراد عام اہل ایمان ہیں۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلاهما فَلاَ تَقُلْ لَهُمَا أُفٍ وَ لاَ تَنْهَرْ هُمَا و قُلْ لَهُمْ قَوْلاً كَرِيمًا (۲۳)

اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اُف تک نہ کہو نہ انھیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو۔

اس آیت میں مخاطب بظاہر پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں لیکن خطاب تمام اہل ایمان سے ہے، مسلمانوں کو اس بات کی تعلیم دینا مقصود ہے کہ اگر ماں باپ تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو نہ ان کے خلاف دل میں کوئی بیزاری پیدا ہونے پائے اور نہ زبان سے ان کے سامنے کوئی حکم سوءادب کا نکلے بلکہ جب بھی ان سے بات کرنے کا موقع آئے شریفانہ اور سعادت مندانہ لہجے میں بات کرو اور ان کی دلداری و تسلی کرتے رہو کیوں کہ خدا کے بعد تمہارے اوپر سب سے بڑا حق والدین ہی کا ہے۔

سورۂ انعام میں ہے:

وَ كَذَّبَكَ به قَوْمُك و هُوالحقُّ قُلْ لَسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيل لِكُلِّ نَبَأٌ مُسْتَقَرٌّ وَ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۔ (۶۶-۶۷)

(تمہاری قوم اس کا انکار کر رہی ہے حالاں کہ وہ حقیقت ہے ان سے کہہ دو کہ میں تم پر حوالہ دار نہیں بنایا گیا ہوں، ہر خبر کے ظہور میں آنے کا ایک وقت مقرر ہے عنقریب تم کو خود انجام معلوم ہو جائے گا)

اس آیت میں ایک ہی شخص یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کیا گیا ہے اس کے بعد جو آیت آرہی ہے اس میں بھی مخاطب ایک ہی شخص کو کیا گیا ہے حالاں کہ مقصود پوری امت

Marfat.com

سے خطاب ہے۔ فرمایا:

وَ إذَا رأيتَ الذِينَ يَخُوضُونَ فِي آياتِنا فَاعْرِضْ عَنْهُمْ حتى يخوضوا فِي حَدِيْثٍ غيرهِ وَ إما يُنْسِيَنَّكَ الشَيطانُ فَلاَ تَقْعُدْ بعدَ الذكرىٰ مَعَ القومِ الظالمين ۔ (٦٨)

(جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں لگ جائیں اور اگر کبھی شیطان تم کو بھلاوے میں ڈال دے تو جس وقت تمہیں اس غلطی کا احساس ہو جائے اس کے بعد پھر ایسے ظالم لوگوں کے پاس نہ بیٹھو)

یہاں خطاب ایک ہی شخص سے ہے لیکن در حقیقت پوری امت کو دو باتوں کی تلقین کرنا ہے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی ذمے داری صرف یہ ہے کہ آیاتِ الٰہی کی تکذیب کرنے والوں کی یاد دہانی کرا دیں، لیکن اگر وہ قرآن کا مذاق اڑانے پر تلے ہوئے طنز و تضحیک کے ترکش سنبھالے ہوئے اور مخالفت کے لیے آستین چڑھائے ہوئے ہیں تو اس وقت طرح دے جاؤ اور جب ان کی یہ بحرانی کیفیت دور ہو جائے تو اس وقت ان کو سنانے اور سمجھانے کی کوشش کرو، اس کے بعد جو آیت آ رہی ہے اس میں اسی حقیقت کی مزید وضاحت کی گئی ہے اور خطاب بھی صراحتاً تمام مسلمانوں کی جانب ہو گیا ہے:

وَ مَا عَلَى الَّذِينَ يتقُونَ مِنْ حِسَابِهِمْ من شيءٍ ولكنْ ذِكرىٰ لَعَلَّهُمْ يتَّقُونَ (٦٩)

ان کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمے داری پرہیز گار لوگوں پر نہیں ہے البتہ نصیحت کرنا ان کا فرض ہے شاید کہ وہ غلط روش سے بچ جائیں۔

یعنی مسلمانوں کے اوپر ان ظالموں اور کافروں سے متعلق جو ذمے داری ہے وہ صرف اللہ کی دعوت اور اس کے دین کو پہنچا دینے کی ہے تا کہ جس طرح وہ خدا سے ڈرنے والے ہیں اسی طرح کفار بھی خدا سے ڈرنے والے بن جائیں ان کے کفر و ایمان کی کوئی ذمہ داری مسلمانوں پر نہیں ہے قرآن کی ایک دوسری آیت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

و قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الكتابِ أن إذا سَمِعْتُمْ آياتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا

Marfat.com

وَ يُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلاَ تَقْعُدُوا مَعَهُم حَتّٰى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهٖ
إِنَّكُمْ إِذًا مِثْلُهُمْ (نساء : ۱۴۰)

(اللہ اس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جارہا اور ان کا مذاق اڑایا جارہا ہے وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انھیں کی طرح ہو)

اِس آیت میں بھی وہی بات کہی گئی ہے جو سورۃ انعام کی آیت میں بیان ہوئی ہے لیکن مفسرین نے انعام والی آیت کو اس آیت سے منسوخ قرار دیا ہے۔ (۸۴) لیکن غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ یہاں نسخ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ اس آیت میں تو صرف مسلمانوں کو کفار اور مکذبین کے ساتھ اس وقت بیٹھنے سے منع کیا گیا ہے جب وہ آیاتِ الٰہی کا مذاق اڑا رہے ہوں تا آنکہ وہ کسی اور شغل میں منہمک ہو جائیں اور آیاتِ الٰہی کے استہزاء سے باز آجائیں اور یہی حکم سورۃ انعام میں بھی ہے۔ (۹۵)

اسی اسلوب کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو، قرآن کہتا ہے:

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ وَ لاَ تَطْغَوا إنه بما تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ولاَ تَرْكَنوا إلى الذينَ ظَلَمُوا فتمسَّكُمُ النَّارُ وَ مَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللّٰه اولياءَ ثُمَّ لاَ تُنْصَرُونَ وَ أَقِمِ الصلوٰة طَرَفَيِ النهَارِ وَ زُلَفًا من اللّيل إنَّ الحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ذلكَ ذكرىٰ لِلذَّاكِرِيْنَ۔
(هود : ۱۱۲-۱۱۴)

پس تم جمے رہو جیسا کہ تمہیں حکم ملا ہے اور وہ بھی جنھوں نے تمہارے ساتھ توبہ کی ہے اور کج نہ ہونا بے شک جو کچھ تم کر رہے ہو وہ اس کو دیکھ رہا ہے اور ان لوگوں کی طرف مائل نہ ہو جیو جنھوں نے ظلم کیا کہ تمھیں بھی دوزخ کی آگ پکڑ لے اور تمھارے لیے اللہ کے سوا کوئی حامی نہ ہو، پھر تمہاری مدد نہیں کی جائے گی اور نماز کا اہتمام کرو دن کے دونوں حصوں میں اور شب کے کچھ حصہ میں، بے شک نیکیاں دور کرتی ہیں بدیوں کو، یہ یاددہانی ہے یاددہانی حاصل کرنے والوں کے لیے۔

یہاں لا تطغوا کہہ کر پوری امت کو رسول اللہ ﷺ کے واسطہ سے خطاب کیا گیا ہے، نبی

Marfat.com

کے واسطہ سے امت کو مخاطب کرنے کی مثال اس آیت میں بھی ملتی ہے:

یَا أَیُّهَا النَّبِیُّ إتق اللّٰهَ وَ لاَ تُطِعِ الکَافِرِیْنَ وَالمُنَافِقِیْنَ اِنّ اللّٰه کان عَلِیْمًا حَکِیْمًا وَ اتَّبِعْ مَا یُوحٰی إِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ إنَّ اللّٰهَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا۔

(احزاب: ۱-۲)

اے نبی اللہ سے ڈرو اور کافروں اور منافقوں کی باتوں پر کان نہ دھرو بیشک اللہ علیم و حکیم ہے اور پیروی کرو اس چیز کی جو تم پر تمہارے رب کی جانب سے وحی کی جارہی ہے، بیشک اللہ ان تمام چیزوں سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔

آخر میں جمع کا صیغہ (تعملون) لاکر گویا اس امر کی صراحت کردی گئی کہ یہ خطاب امت سے ہے، اس کے بعد فرمایا:

وَ تَوَکَّلْ عَلَی اللّٰهِ وَ کَفٰی بِاللّٰهِ وَکِیْلاً مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِهِ وَ مَا جَعَلَ أَزْوَاجَکُمُ اللّٰئِی تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ أُمَّهَاتِکُمْ وَ مَا جَعَلَ أَدْعِیَاءَ کُمْ أَبْنَاءَ کُمْ ذَالِکُمْ قَوْلُکُمْ بِأَفْوَاهِکُمْ۔ (احزاب :۳-۴)

اور اللہ پر بھروسہ رکھو اور بھروسے کے لیے اللہ کافی ہے اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں رکھے اور نہ تمہاری ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کر بیٹھتے ہو تمہاری مائیں بنایا اور نہ تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے بیٹے بنایا یہ سب تمہارے اپنے منہ کی باتیں ہیں۔

ان آیات میں بار بار جمع کے صیغوں اور ضمائر کا استعمال یہ صراحت کر رہا ہے کہ خطاب عام امت مسلمہ سے ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر براہ راست لوگ مخاطب ہوں، اس قسم کا طرز تخاطب کبھی کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کے پہلے یا بعد میں آتا ہے، ایسے موقع پر لوگ بڑی الجھن میں مبتلا ہو جاتے ہیں چناں چہ ضمیروں کے آگے پیچھے ہونے کی وجہ سے مفہوم کو متعین کرنے میں سخت دشواری پیش آتی ہے حالاں کہ ضمیروں کا یہ ہیر پھیر درحقیقت مرکب مخاطب کے اسلوب کا نتیجہ ہوتا ہے اس لیے اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہوتی (۸۶) سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے:

فَمَا لَکُمْ فِی الْمُنَافِقِیْنَ فِئَتَیْنِ وَاللّٰهُ أَرْکَسَهُمْ بِمَا کَسَبُوْا أَتُرِیْدُوْنَ أَنْ

Marfat.com

تَهْدُوْا مَنْ أَضَلَّ اللّٰهُ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلاً۔ (نساء: ۸۸)
پس تمھیں کیا ہوا کہ تم منافقین کے بارے میں دو گروہ ہو رہے ہو اللہ نے تو انھیں ان کے کیے کی پاداش میں پیچھے لوٹا دیا ہے کیا تم ان کو ہدایت دینا چاہتے ہو جن کو خدا نے گمراہ کر دیا ہے؟ جن کو خدا گمراہ کر دے تم ان کے لیے کوئی راہ نہیں پا سکتے۔

سورہ بقرہ کی مندرجہ ذیل آیات میں قرآن کا اسلوب تخاطب ملاحظہ فرمایئے:

يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لاَ تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوْا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا وَ لِلْكَافِرِيْنَ عَذَابٌ أَلِيْمٌ وَ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ أَهْلِ الكِتَابِ وَ لاَ الْمُشْرِكِيْنَ أَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۔ مَانَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أو نُنْسِهَا نَأتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ والأَرْضِ وَ مَا لَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِن وَّلِيٍّ وَّلاَ نَصِيْرٍ ۔ (بقرہ : ۱۰۴-۱۰۷)

اے ایمان والو! تم "رَاعِنَا" نہ کہا کرو "اُنْظُرْنَا" کہا کرو اور توجہ سے سنا کرو، کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے جن لوگوں نے کفر کیا اہل کتاب ہوں یا مشرکین، نہیں چاہتے کہ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے کوئی رحمت نازل ہو اور اللہ اپنی رحمت کے لیے خاص کرتا ہے جن کو چاہتا ہے، البتہ بڑے فضل والا ہے۔

جو کوئی آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اس کو نظر انداز کرتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے مانند دوسری لاتے ہیں کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی دوست ہے نہ مددگار۔

ان آیات میں بھی أَلَمْ تَعْلَمْ میں خطاب واحد ہے، اور نبی کے واسطے کے بغیر تمام امت کو مخاطب کیا گیا ہے۔

تیسری آیت ملاحظہ ہو یہ آیت قومِ عاد کی تیز و تند آندھی سے ہلاکت کے بیان میں ہے:

فَتَرَىٰ القَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٌ (حاقة : ۷)
پس تم دیکھتے کہ وہ وہاں اس طرح پچھاڑے پڑے ہیں گویا کہ کھجوروں کے کھوکھلے تنے ہوں۔

Marfat.com

یہاں بھی خطاب عام ہے مطلب یہ ہے کہ اے مخاطب اگر تو وہاں موجود ہوتا تو دیکھتا کہ اللہ کے عذاب نے ان کو اس طرح میدان میں پچھاڑ کے ڈال دیا ہے کہ گویا وہ کھجوروں کے کھوکھلے تنے ہوں جو ہوا کے زور سے اِدھر اُدھر لڑھکتے پھر رہے ہوں۔

چند ضروری نکات:

۱۔ اس اسلوب میں مخاطب کے موزوں اور برمحل الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں مثال کے طور پر قرآن نے جہاں امور فطرت کی تعلیم دی ہے جیسے توحید کی تعلیم، قرابت داروں اور یتیموں سے حسن سلوک کی تلقین وغیرہ وہاں "یا ایُّھَا النَّاسُ" کہہ کر خطاب کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ فرائض مجرد انسان ہونے کے ناطے سے ہر انسان پر لازم ہیں لیکن جب فرائض دین اور اوامر شریعت کی تعلیم دی جاتی ہے تو "یا ایُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا" کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے یعنی یہ ذمہ داریاں اہل ایمان پر اس وجہ سے واجب ہیں کہ انھوں نے اپنے رب سے اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد کیا ہے۔

۲۔ قرآن میں جہاں استغفر اللہ کہہ کر نبی کو خطاب کیا گیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اے نبی تم لوگوں کے لیے اللہ سے مغفرت چاہو مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ وَ لَا تَكُنْ لِّلْخَائِنِيْنَ خَصِيْمًا وَ اسْتَغْفِرِ اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا وَ لَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ أَنْفُسَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا أَثِيْمًا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَ لَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُوْنَ مِمَّا لَا يَرْضٰى مِنَ اللّٰهِ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا هٰٓأَنْتُمْ هٰٓؤُلَاءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَمْ مَنْ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا وَ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْءًا أَوْ يَظْلِمْ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا وَ مَنْ يَّكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلٰى نَفْسِهِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۔ (نساء: ۱۰۵-۱۱۱)

ہم نے یہ کتاب تم پر حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں دکھایا ہے اور تم بدعہدوں کے حمایتی نہ بنو اور اللہ سے مغفرت

Marfat.com

مانگو بیشک اللہ غفور رحیم ہے اور ان لوگوں کی وکالت نہ کرو جو اپنے آپ سے خیانت کررہے ہیں اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو بدعہد اور حق تلف ہیں، یہ لوگوں سے تو چھپتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپتے حالاں کہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب کہ وہ ناپسندیدہ سرگوشیاں کرتے ہیں اور اللہ جو کچھ وہ کرتے ہیں سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے، یہ تم ہو جنھوں نے دنیا کی زندگی میں ان کی مدافعت کی تو قیامت کے دن اللہ سے کون ان کی مدافعت کرے گا یا کون ان کا ذمہ دار بنے گا اور جو کسی بدی کا ارتکاب کرے یا اپنی جان پر کوئی ظلم ڈھائے پھر اللہ سے مغفرت چاہے تو وہ اللہ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پائے گا، اور جو کسی بدی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا وبال اس کے سر آتا ہے اور اللہ علیم وحکیم ہے۔

ان آیات میں بظاہر خطاب کا رخ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے لیکن اس میں عتاب کا رخ ان مسلمانوں کی طرف ہے جو منافقین کی حمایت کرتے تھے۔ کہا جارہا ہے کہ اے مسلمانو تم ان لوگوں کے حمایتی اور وکیل نہ بنو جو اللہ اور رسول سے بدعہدی اور خیانت کررہے ہیں، یہ لوگ انسانوں سے تو چھپتے ہیں اور چھپ چھپ کر اللہ ورسول کے خلاف سرگوشیاں کرتے ہیں لیکن اس اللہ سے کہاں چھپ سکتے ہیں جو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ اپنی ناپسندیدہ سرگوشیوں میں مصروف ہوتے ہیں آیات ۱۰۹ اور ۱۱۰ میں یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ پیغمبر کو خطاب کرکے کن کے رویے پر سرزنش کی گئی ہے۔(۸۷)

۳۔ نبی بندوں کے سامنے خدا کا ترجمان اور خدا کی بارگاہ میں بندوں کا وکیل ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کبھی خدا کی زبان سے وہ بندوں کو تنبیہ وتذکیر کرتا ہے اور کبھی بندوں کی طرف سے اللہ کے حضور مجادلہ اور عرض معروض کرتا ہے جس وقت وہ اللہ کی ترجمانی کرتا ہے اس وقت اس کو کسی ملامت گر کی ملامت اور جھگڑے کی پروا نہیں ہوتی اور جب بندوں کی طرف سے خدا کے دربار میں ترجمان بن کر حاضر ہوتا ہے تو وہ گریہ وزاری بھی کرتا ہے اور مجادلہ ومباحثہ بھی اور اسے اس بات کی مطلق تشویش نہیں ہوتی کہ بندوں کے گناہ بڑے ہیں اور اس باب میں اس کی سفارش مردود ہوجائے گی چناں چہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ اس سے اس انداز میں بات کرتا ہے کہ اس پر عتاب کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

چوں کہ نبی بندوں کا ترجمان ہونے کی حیثیت سے ان کے خیالات کی خدا کے سامنے

Marfat.com

ترجمانی کرتا ہے اور بندوں سے خدا کے پیغام کی ترجمانی کرتا ہے اس لیے خدا بھی اس سے اسی حیثیت سے خطاب کرتا ہے گویا وہی پوری امت کا قائم مقام ہے۔

اس نکتے کو اگر سامنے رکھا جائے تو بہت سے اشکالات حل ہو جائیں گے اور قرآن وانجیل کی اکثر آیتوں کی صحیح تاویل میں بڑی آسانی ہو گی، علمائے نصاری نے انجیل کی آیتوں اور حضرت مسیح کے اقوال کی توجیہ میں اسی لیے غلطیاں کیں، مثال کے طور پر حضرت مسیح کا یہ قول دیکھیے:

إلٰهی إلٰهی لِمَ خَذَلْتَنِیْ۔ (اے میرے خداوند کیوں تو نے مجھ کو چھوڑ دیا)

ظاہر ہے یہاں مخذول سے مراد یہودی قوم ہے لیکن چوں کہ حضرت مسیح ان کے نمائندہ اور ترجمان تھے اس لیے انھوں نے ان کے بجائے اپنا ہی نام لیا۔

التفات:

قرآن عربی خطابت کا ایک اعلی اور بے مثل نمونہ ہے اس میں زور بیان کے ساتھ مخاطب کی نفسیات اور مواقع کلام کی رعایت پوری طرح موجود ہوتی ہے، یہ نوع انسانی کے ایک ایک فرد کو خطاب کرتا ہے اور ایک ایک دل ودماغ کے پردے پر دستک دیتا ہے، یہ عوام الناس کو انذار وتبشیر کر رہا ہوتا ہے کہ یک بیک پہلو بدل کر مکذبین کو ان کے انجام کی دھمکی بھی دے دیتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسکین اور دلجوئی کا سامان مہیا کر رہا ہوتا ہے کہ بیچ ہی میں کفار ومشرکین کی شہ رگ کو جا پکڑتا ہے اور یہی بہترین خطابت کی علامت بھی ہے، اسی کو التفات کہا جاتا ہے۔(۸۸)

یہ اسلوب عربی ادب میں بہت معروف ہے کلامِ عرب میں اس کی مثالیں بہت ہیں مثال کے طور پر جریر بن عطیہ خطفی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مدح کرتے کرتے درمیان میں التفات کا یہ اسلوب استعمال کرتا ہے اور کہتا ہے:

أتَنْسٰی إذْ تُوَدِّعُنَا سُلَیْمٰی بفرع بَشَامَة سُقِیَ البشام (۸۹)

(کیا تم بھول رہے ہو جب کہ سلیمی ہمیں فرع بشامہ پر الوداع کر رہی تھی بشام (ایک خوشبو دار اور خوش ذائقہ درخت جس کو مسواک کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے) سرسبز و شاداب رہے)

اسی کا ایک دوسرا شعر ہے:

Marfat.com

متیٰ کانَ الخیامُ بذی طلوح سُقِیتِ الغیثَ أیتها الخیامُ (۹۰)

(مقام ذی طلوح میں خیمے کب نصب تھے؟اے خیمو! بارش کی وجہ سے تمہیں سرسبزی و ہریالی نصیب ہو)

اس شعر میں سُقِیت الغَیثَ التفات ہے۔

ایک اور موقع پر یہی شاعر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا مرثیہ کہتے ہوئے بیچ میں حمام کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اسے یوں دُعا دیتا ہے:

طَرِبَ الحَمَامُ بذِی الاراك فها جنی لا زلت فی غللٍ و أیُك نَاضرٍ (۹۱)

(اراک پر بیٹھی ہوئی کبوتری چہچہا اُٹھی اور اس نے مجھے برانگیختہ کر دیا، اے حمام! خدا کرے تو ہمیشہ رواں دواں نہر اور تر و تازہ گھنی جھاڑیوں والے درخت پر بسیرا کرے)

قرآن نے اس اسلوب کو بکثرت استعمال کیا ہے مثال کے طور پر سورۂ نحل میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إلاَّ رِجَالاً نُوْحِیْ إلیهم۔

(اے نبی ہم نے تم سے پہلے بھی آدمیوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا جن کی طرف ہم وحی کرتے ہیں)

پھر وہ انسانوں کی جانب متوجہ ہو کر فرماتا ہے:

فَأسْئَلُوْا أهْلَ الذِّكْرِ إنْ كُنْتُمْ لاَ تَعْلَمُونَ (نحل : ۴۳)

(تو اہل علم سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے)

پھر وہ نبی کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور کہتا ہے:

وَ أنْزَلْنَا إلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إلَیهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ (نحل: ۴۴)

(اور ہم نے تم پر بھی یاد دہانی اتاری تاکہ تم لوگوں پر اس چیز کو اچھی طرح واضح کر دو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے اور تاکہ وہ غور کریں۔(۹۲)

یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ گو سارا قرآن وحی الٰہی ہے لیکن سب کا سب اللہ ہی کی زبان سے ادا نہیں ہوا ہے بلکہ اس میں ایسی دعائیں بھی ہیں جو خدا نے اپنے بندوں کو سکھائی ہیں۔(۹۳) اسی طرح اس میں مؤمنین، کافرین، ملائکہ اور عام انسانوں کے اقوال کی حکایت بھی

Marfat.com

موجود ہے۔ اگر حکایت صراحت کے ساتھ ہوتی ہے تو اسے سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی لیکن بسااوقات تصریح نہ ہونے کی وجہ سے دقت پیش آتی ہے ایسی صورت میں خطاب کرنے والے کی تعیین موقع کلام اور حسن تاویل سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جن آیتوں میں خدا کے علاوہ دوسروں کا خطاب مذکور ہے ان کی بعض مثالیں درج ذیل ہیں:

وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلاّ بِأَمْرِ رَبِّكَ لَهٗ مَابَيْنَ أَيْدِيْنَا وَ مَا خَلْفَنَا وَ مَا بَيْنَ ذَلِكَ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا (مریم : ۶۴)

"اور ہم نہیں اترتے مگر آپ کے رب کے حکم سے، ہمارے آگے اور پیچھے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے سب اسی کے اختیار میں ہے اور آپ کا رب کسی کو بھولنے والا نہیں ہے۔"

اسی طرح سورۂ صافات میں ہے:

وَ مَا مِنَّا إِلاّ لَهٗ مَقَامٌ مَعلُومٌ وَّ إِنّا لَنَحنُ الصَّافُّونَ وَ إِنَّا لَنَحنُ الْمُسَبِّحُونَ۔ (۱۶۴-۱۶۶)

"اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے بس ایک معین مقام ہے اور ہم تو خدا کے حضور میں صف بستہ رہنے والے ہیں اور ہم تو اس کی تسبیح کرتے رہنے والے ہیں۔"

ظاہر ہے یہ باتیں فرشتوں کے گل سر سبد حضرت جبریلؑ کی زبان سے کہلوائی گئی ہیں۔ جو لوگ فرشتوں کے شریک خدا ہونے کے وہم میں مبتلا تھے ان کے وہم پر ضرب لگانے کے لیے سب سے زیادہ موثر چیز یہی ہو سکتی تھی کہ خود حضرت جبریلؑ ان کے آگے اپنی اور پورے زمرۂ ملائکہ کی حیثیت واضح کر دیں۔ اب اگر ان آیات کو اللہ کی طرف منسوب کر دیا جائے تو کتنی بڑی غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے اور خدا کی عظمت پر بری طرح حرف آنے لگتا ہے۔

التفات کے فوائد:

قرآن میں التفات کی مثالیں بے شمار ہیں اس کا یہ فائدہ بالکل عام ہے کہ اس کے ذریعہ مخاطب یا سامع کو ہوشیار اور خبر دار کیا جاتا ہے کیوں کہ انسان عام طور سے غفلت اور جمود کا شکار ہوتا ہے۔ بہت سے واقعات اور دلائل آنکھوں کے سامنے سے گذرتے ہیں لیکن وہ ان سے کوئی سبق نہیں لیتا۔ یہ اس کی مالوف عادت ہے۔ اسی لیے التفات کا استعمال اکثر جمود و تعطل کی فضا کو درہم برہم کرنے اور انسان کو فکر و نظر کا عادی بنانے کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے دوسرے فوائد

Marfat.com

حسب ذیل ہیں۔

۱۔ بعید کو قریب اور غائب کو حاضر بنانا تاکہ مقصود ذہن میں پوری طرح بیٹھ جائے۔ مثال کے طور پر وَ إِنْ مِّنْكُمْ إِلاَّ وَ ارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَ نَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا۔ (مریم :۷۱-۷۲)

تم میں سے ہر ایک کو بہر حال اس میں داخل ہونا ہے یہ تیرے رب کے اوپر ایک طے شدہ امر واجب ہے پھر ہم ان لوگوں کو نجات بخشیں گے جنھوں نے تقوی اختیار کیا ہوگا اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کو اس میں اکڑوں بیٹھے چھوڑیں گے)

ان آیات سے پہلے کفار و منکرین کا تذکرہ تھا اور بصیغۂ غائب ان سے وہی بات کہی گئی تھی جو ان آیات میں خطاب کے اسلوب میں کہی گئی ہے اور خطاب کا یہ اسلوب شدت عتاب پر دلیل ہے۔ ماقبل کی آیات ملاحظہ ہوں۔

وَ يَقُوْلُ الْإِنْسَانُ ءَ إِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ يَكُ شَيْئًا فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ثُمَّ لَنَحْنُ أَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ أَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا۔ (مریم : ۶۶-۷۰)

''اور انسان کہتا ہے کہ کیا میں مر جاؤں گا تو زندہ کر کے نکالا جاؤں گا کیا یہ انسان اس بات کو نہیں چیتتا کہ ہم نے اس کو اس سے پہلے پیدا کیا در آں حالیکہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔ پس تیرے رب کی قسم، ہم ان کو بھی اور شیطانوں کو بھی اکٹھا کریں گے پھر ہم ان کو جہنم کے گرد اس طرح کریں گے کہ وہ دوزانو بیٹھے ہوئے ہوں گے پھر ہم ہر گروہ میں سے ان کو چھانٹ کر الگ کریں گے جو خدائے رحمان سے سب سے زیادہ سرکشی کرنے والے رہے ہوں گے۔ پھر ہم ان لوگوں کے سب سے زیادہ جاننے والے ہوں گے جو اس جہنم میں داخل ہونے کے سب سے زیادہ سزاوار ہوں گے۔''

یہاں آپ غور کریں تو دیکھیں گے پہلے غائب کے صیغوں کے ذریعہ مجرموں کا حال بیان ہوا ہے پھر انہی مجرموں کو خطاب کر کے اللہ نے فرمایا ہے کہ تم میں سے ہر ایک کو بلا استثناء جہنم میں اترنا ہے ساتھ ہی نبی کو اطمینان دلایا ہے کہ یہ امر بالکل قطعی اور طے شدہ ہے۔ اس کو تمہارے رب نے اپنے اوپر لازم ٹھیرالیا ہے۔ ایک دن تم اپنے دشمنوں کا یہ انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ (۹۴)

Marfat.com

۲۔ التفات زور بیان کے اظہار کے لیے اور خطاب کو موثر اور موکد بنانے کے لیے بھی لایا جاتا ہے اس موقع پر مخاطب کے لیے سننا ضروری نہیں ہے بلکہ غیظ و غضب کے اظہار کے لیے اس اسلوب کو استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب فرعون غرقابی کے وقت پینترہ بازی کرنے لگا اور ناک رگڑ رگڑ کر اس حقیقت کا اعلان کرنے لگا جس کا نام سننا بھی اسے پہلے گوارا نہ تھا تو اللہ نے کلام کا رخ بدل کر اسے ڈانٹا۔

"آلْئٰنَ وَ قَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ" (یونس: ۹۱)

(کیا اب! حالاں کہ تم نے اس سے پہلے نافرمانی کی اور تم فساد برپا کرنے والوں میں سے تھے)

یعنی اب ماننے جب ماننے کا وقت گذر گیا، اب مسلم بننے کا اقرار کرتے ہو در آں حالیکہ ساری زندگی فساد میں گذری۔

رسول پاک ﷺ نے غزوۂ بدر میں اصحاب قلیب کو اسی انداز سے خطاب کیا تھا آپ نے مُردوں کو خطاب کر کے فرمایا تھا:

يا أهل القليب يا عتبة ابن ربيعة و يا شيبة بن ربيعة و يا امية بن خلف و يا أباجهل بن هشام هل وجدتم ما وعدكم ربكم حقّا فأنى قد وجدت ما وعدنى ربّى حقا۔ يا أهل قليب بئس عشيرة النبيّ كنتم لنبيكم كذبتمونى و صدقنى الناس و أخرجتمونى و آوانى النّاس و قاتلتمونى و نصرنى النّاس۔ (۹۵)

(اے گڑھے والو! اے عتبہ بن ربیعہ! اے شیبہ بن ربیعہ اور اے امیہ بن خلف! اور اے ابو جہل بن ہشام! تمہارے پروردگار نے جو تم سے وعدہ کیا تھا کیا تم نے اسے سچا پایا؟ مجھ سے تو میرے پروردگار نے جو کچھ وعدہ کیا تھا میں نے سچا پایا! اے گڑھے والو! تم اپنے نبی کے لیے اس کی قوم کے برے ثابت ہوئے تم نے مجھے جھٹلایا دوسرے لوگوں نے میری تصدیق کی! تم نے مجھے گھر سے نکالا اور دوسرے لوگوں نے مجھے پناہ دی تم نے مجھ سے جنگ کی اور دوسرے لوگوں نے میری مدد کی!)

یہاں آپ نے جن لوگوں سے خطاب فرمایا ہے وہ سب مردے ہیں۔ مقصد انہیں سنانا نہیں تھا بلکہ شدت غضب اور زور بیان کا اظہار مقصود تھا اس لیے آپ نے غائب کفار کو حاضر متصور کر کے خطاب فرمایا۔

۳۔ التفات کا تیسرا فائدہ زجر و توبیخ اور ملامت کرنا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ مریم

Marfat.com

میں کفار و مشرکین کے کارناموں کو غائب کے صیغے سے اس لیے بیان کیا تاکہ اس کی ناگواری اور گھناؤنا پن واضح ہو جائے۔ کیوں کہ یہ حرکتیں خدائے واحد کے ساتھ انتہائی بے ادبی اور گستاخی پر مبنی ہیں لیکن معاً بعد التفات کے ذریعہ حاضر کا صیغہ استعمال کیا کیوں کہ مقصد مشرکین کو ملامت کرنا اور انھیں متنبہ کرنا تھا:

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا۔ (مریم: ۸۸-۸۹)

(اور کہتے ہیں کہ خدائے رحمان نے اولاد بنار کھی ہے۔ یہ تم نے بہت سنگین بات کہی ہے)

۴۔ التفات کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ مخاطب کی قدر و منزلت کا اقرار اور اس کے سامنے عاجزی و انکساری کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ فاتحہ میں آغاز میں غائبانہ انداز میں حمد و تقدیس کی جاتی ہے اس کی رحمانیت اور قدرت کے گُن گائے جاتے ہیں۔ پھر خدا کو خطاب کرتے ہوئے اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار ہوتا ہے اور آخر میں اس سے ہدایت کی توفیق اور غضب سے بچنے کی دعا ہوتی ہے:

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلاَ الضَّالِّيْنَ۔ (فاتحہ : ۴-۷)

(ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت بخش۔ ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے اپنا فضل فرمایا جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ)

امرؤالقیس اپنے معلقہ میں پہلے محبوبہ کا غائبانہ تعارف کراتا ہے۔ اس سے اپنے عشق و محبت کی داستان بیان کرتا ہے، اس کی خوب صورتی اور نزاکت پر سر دھنتا ہے اور پھر کلام کا پہلو بدل کر اسے براہ راست مخاطب کرتے ہوئے یوں حال دل سناتا ہے:

ألا رب خصم فيك الوى رددته نصيحٍ على تعذا له غير موتل (۹۶)

(تمہاری محبت کے تئیں جھگڑا کرنے والے کتنے ہی رقیبوں کو میں نے دھتکار دیا جو اپنی توبیخ میں خیر خواہ معلوم ہوتے تھے اور مجھ کو باز رکھنے میں کسی قسم کا کسر نہ اٹھا رکھتے تھے)

کعب بن زہیر سلمی کی وہ قصیدہ جو حضور اکرم ﷺ کی مدح و منقبت میں کہا گیا ہے اس اسلوب کی بہترین مثال ہے۔ ابتداء کے ۳۸ اشعار میں وہ بصیغۂ غائب حضور کی مدح کرتے ہیں اور پھر بڑے پیار بھرے انداز میں کلام کا رخ موڑ کر کہتے ہیں:

Marfat.com

أُنبِئتُ اَنّ رسول الله اوعدنی والعفو عند رسول الله مامــولُ
مهلاً ! هداك اللّٰه الذی اعطاك نافلة القرآن فیها مواعیظُ و تفصیلٌ
لا تاخذنی باقوال الوشاة و لَمْ أذنب و اِن کثرت فِیّ الاقاویلُ (۹۷)

(مجھے بتایا گیا ہے کہ اللہ کے رسول نے مجھ کو معاف کر دینے کا وعدہ کیا ہے اور عفو ہی اللہ کے رسول سے متوقع ہے۔

دیکھیے! اللہ نے آپ کو ہدایت دی۔ اس نے قرآن آپ کو دیا جس میں نصیحتیں ہیں، اور ہر چیز کی تفصیل موجود ہے۔

چغل خوروں کی باتوں میں آکر میرا محاسبہ نہ کیجیے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے چاہے میرے بارے میں کتنی ہی باتیں اڑ رہی ہوں)

۵۔ التفات کا ایک اہم فائدہ مخاطب کو تسلی دینا اور کچھ اہم حقیقتوں سے پردہ اٹھانا ہے مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کے آغاز میں آیت ۵ تک قرآن اور نبی پر ایمان لانے والوں کی صفات کا تذکرہ کرنے کے بعد آیت ۶ اور ۷ میں آنحضرتؐ کو براہ راست خطاب کر کے کہا گیا:

إنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أ أنذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لاَ يُوْمِنُوْنَ. خَتَمَ اللّٰهُ عَلى قُلُوبِهِمْ وَ عَلى سَمْعِهِمْ وَ عَلى أبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (بقره : ۶-۷)

(جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے یکساں ہے ڈراؤ یا نہ ڈراؤ۔ وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔)

ان آیتوں کا اصل مدعا پیغمبر کو صرف یہ خبر دینا نہیں ہے کہ فلاں گروہ کے لوگ خواہ ان کو ڈراؤ یا نہ ڈراؤ ایمان لانے والے نہیں ہیں بلکہ یہ دونوں آیات ایک تو پیغمبر کے لیے تسکین و تسلی اور مخاطبین کے لیے سرزنش اور دھمکی بن کر آئی ہیں یعنی ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے انذار و تبلیغ میں کوئی خامی یا کسر نہیں ہے بلکہ اللہ کے دین کو جھٹلاتے جھٹلاتے یہ خود قانون الٰہی کی زد میں آکر اپنی ساری صلاحیتوں سے محروم ہو چکے ہیں۔

دوسرے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ ہدایت صرف اس شخص کو ملتی ہے جو

Marfat.com

اپنی ان صلاحیتوں کو استعمال کرتا ہے۔ لیکن اگر کوئی قدرت کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام نہ لے تو چاہے وہ لاکھ سر مارے اسے ہدایت کی راہ کبھی نہیں مل سکتی۔

اسی طرح سورہ بقرہ میں آیات ۲۱ سے ۲۹ میں التفات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بنی اسماعیل کو خطاب کیا گیا ہے ذرا دیر کے لیے یہود سے صرف نظر کر کے عربوں کو اس بات کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ یہود کی حسد اور ان کے پھیلائے ہوئے شگوفوں اور وسوسہ اندازیوں کا شکار ہونے کے بجائے اس نعمت عظمیٰ قرآن کی قدر کریں اور اس سے ہدایت حاصل کریں ورنہ یہود کی فتنہ پردازیوں میں مبتلا ہو کر اگر انہوں نے قرآن کی نعمت سے اپنے آپ کو محروم کر لیا تو وہ یاد رکھیں کہ اس کی سزا بڑی ہی سخت ہے۔ فرمایا:

يَآ أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قبلكم لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (بقره:۲۱)

(اے لوگو! بندگی کرو اپنے اس خداوند کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے گذرے ہیں تاکہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہو)

اسی طرح آیت ۷۴ تک یہود کو خطاب کرتے کرتے آیت ۷۵ میں خطاب کا رخ مسلمانوں کی طرف مڑ گیا اور انہیں مخاطب کر کے فرمایا:

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّوْمِنُوا لَكُمْ وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثم يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ۔ (بقره: ۷۵)

(کیا تم لوگ یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمہاری بات مان لیں گے اور حال یہ ہے کہ ان میں سے ایک گروہ اللہ کے کلام کو سنتا رہا ہے اور اس کو سمجھ چکنے کے بعد اس کی تحریف کرتا رہا ہے اور وہ جانتے ہیں)

اس التفات کے دو مقصد ہیں ایک تو مسلمانوں کو یہ اطمینان دلانا کہ وہ بنی اسرائیل کی مخالفت سے نہ بد دل ہوں نہ اس پر متعجب کہ یہ پڑھے لکھے اور دین و شریعت کے عالم لوگ اس دعوت کی مخالفت کر رہے ہیں۔ دوسرا مقصد مسلمانوں کو یہود کی بعض پس پردہ حرکات اور سازشوں سے آگاہ کرنا ہے تاکہ سادہ لوح مسلمان ان کے دام فریب کا شکار نہ ہوں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ یہ مکر و فریب کا کاروبار ہے جو یہودی ایمان کے دعوی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔

Marfat.com

۹- قِران و وصل

عطف کے ساتھ یا بغیر عطف کے دو الفاظ یا متصل جملوں کو ایک ساتھ لانا قران کہلاتا ہے۔اس سے مختلف معانی اور متنوع مفاہیم کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ جن میں چند ایک کی وضاحت ذیل میں کی جاتی ہے:

۱۔ قِران کا اولین فائدہ دو متصل جملوں یا دو الفاظ کو معانی کے اعتبار سے ایک امر کلی میں شامل کرنا ہے۔ مثالوں سے اس کی وضاحت ہو گی۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ (رحمن: ۵-۶)

(سورج اور چاند ایک متعین مسافت پر سرگرم عمل ہیں اور ستارے اور درخت سجدہ ریز ہیں)

اس آیت کے دو اجزاء ہیں ایک **الشمس والقمر بحسبان** جس کا مفہوم یہ ہے کہ شمس و قمر ایک نظام کے پابند ہیں اور نظم و ضبط کے ساتھ اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔(۹۹) یعنی انہیں ایک لامتناہی قدرت نے اپنے قبضے میں جکڑ رکھا ہے اس سے یہ انحراف نہیں کر سکتے گویا یہ اس کی اطاعت و عبادت میں مصروف ہیں۔ دوسرے جز **والنجم والشجر یسجدان** میں بھی یہی بات کہی گئی ہے کہ ستارے اور درخت سجدہ ریز ہیں اس طرح عبادت اور سجدہ ریزی یہ امر کلی ہے جس میں دونوں جملوں کا مفہوم شامل ہے اور قران سے یہاں یہی فائدہ حاصل کیا گیا ہے۔اس آیت میں شمس و قمر اور نجم کہہ کر عالم جمادات کی تسخیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور شجر سے عالم نباتات کی سرافگندگی کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ اس اسلوب کا دوسرا فائدہ تاکید و توضیح ہے اگر پہلے لفظ یا جملے میں کوئی ابہام یا اجمال ہو تو دوسرے لفظ یا جملے کے ذریعہ اس کی وضاحت کر دی جاتی ہے اور بات موکد ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک میں اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيم ۔ (بقرہ: ۲۷۶)

(اللہ کسی ناشکرے حق تلفی کرنے والے انسان کو پسند نہیں کرتا)

اس آیت میں "اَثیم" کفار کی مزید وضاحت کے لیے ہے۔ کفار کے معنی ناشکرے کے ہیں اور اثیم کے معنی دوسروں کے حقوق تلف کرنے والے کے ہیں۔ [illegible] اللہ [illegible] بات فرمائی ہے کہ اللہ سود کو گھٹائے گا اور صدقات کو بڑھائے گا۔ اثیم کا لفظ اس بات کی وضا[illegible]

Marfat.com

اللہ تعالیٰ سود خور کے سرمایہ کو مٹائے گا۔ فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کسی ناشکرے اور حق تلفی کرنے والے کو محبوب نہیں رکھتا۔ اسی سورہ کا ایک دوسرا ٹکڑا ہے:

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ (بقرہ:۲۵۵) (وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے)

علیّ اور عظیمٌ دونوں تقریباً ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں، (۱۰۰) لیکن ان کا ایک ساتھ تذکرہ خدا کی بلندی و عظمت کے ناپیدا کنار ہونے کو بتاتا ہے یعنی اس کی ہستی بڑی ہی بلند اور بہت ہی عظیم ہے۔ اس کے علم اس کی قدرت اور اس کی وسعت کو اپنے محدود پیمانوں سے نہ ناپو ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے۔

اسی طرح "عزیز مقتدر" "عزیز جبار" اور "عزیز ذوانتقام" سب ایک دوسرے کی تاکید کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ ان تینوں مقامات میں سے ہر ایک اپنی حقیقت کے ساتھ محض مبالغہ کے لیے اور اس کی ہیبت و عظمت کا نقش دلوں پر قائم کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

۳۔ قران کا ایک فائدہ دو مقابل معانی کی وضاحت بھی ہے۔ قرآن میں بار بار دو مقابل الفاظ ایک ساتھ استعمال ہوئے ہیں جن میں ایک ظاہر بین نگاہ فرق اور تفاوت محسوس کر سکتی ہے لیکن اس اسلوب کے ذریعہ دراصل دونوں کی باہمی قربت اور تعلق کو واضح کرنا ہوتا ہے مثال کے طور پر العزیز الغفار، العزیز الرحیم، العزیز الحکیم، العزیز العلیم وغیرہ کی صفات دیکھیے ان میں بظاہر بہت بُعد ہے۔ کہاں اقتدار و حاکمیت کا تصور اور کہاں رحمت و حکمت اور علم کا تصور؟

لیکن قرآن میں یہ صفات ایک ساتھ اس لیے مستعمل ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اللہ کی ذات اگر ایک طرف متکبرین اور سرکش انسانوں کے لیے قہر و غضب کی علامت اور اقتدار و حاکمیت کی برق بے اماں ہے۔ جو ہر ظالم و جابر اور مفسد انسان کی متاع حیات کو خاکستر کر دیتی ہے تو دوسری طرف اس کی ذات رحمت و حکمت اور علم کے اوصاف سے متصف ہے۔ وہ اپنے نیک بندوں کے ساتھ رحمت و رافت کا معاملہ کرتا ہے۔ انہیں ہر طرح کی سہولتیں اور نوازشیں عطا کرتا ہے اور دنیا و آخرت میں انہیں پناہ اور حفاظت فراہم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی یہ صفت اپنے بندوں میں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ چناں چہ سورہ فتح میں ان کی خصوصیت یوں بیان کرتا ہے:

اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بينهم۔ (۲۹) (وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحم دل ہیں)

یعنی ان کی تمام حمیت و عصبیت ایمان و اسلام پر قائم ہے۔ جو ایمان و اسلام میں ان کے شریک نہیں ہیں وہ اگر ان کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہیں تو ان کے اندر انگلی دھنسانے کی کوئی گنجائش نہیں پائیں گے۔ برعکس اس کے اپنے شریک ایمان بھائیوں کے لیے وہ سراپا رحمت و شفقت ہیں۔

Marfat.com

۱۰- حذف

حذف کا مطلب ہے کہ کلام کے ان غیر ضروری اجزاء کو نکال دیا جائے جن کے بغیر بھی وہ پوری طرح سمجھ میں آجائے۔ جو چیزیں قابل فہم ہوں انھیں اس اسلوب میں سامع کی وضاحت اور زود فہمی پر اعتماد کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ (۱۰۱) کلام افہام وتفہیم کا ذریعہ ہے اس لیے الفاظ اور جملے کم اور معانی وسیع ہوں تو ان کی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔ عبدالقاہر جرجانی نے حذف کو سحر سے مشابہ اسی وجہ سے قرار دیا ہے کہ اس میں ذکر کے مقابلے میں عدم ذکر فصیح ہوتا ہے۔ نطق کے مقابلے میں سکوت زیادہ مفید ہوتا ہے اور گویائی پر عدم گویائی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ (۱۰۲)

عربوں کی ذہانت وفطانت اور قدرت کلام مشہور ہے۔ وہ **الحرُّ یکفیه الإشارة** کے عادی اور پابند تھے۔ ان کے نزدیک سب سے موثر اور بلیغ کلام وہ ہے جو **ما قلّ و ما دلّ** ہو اور جو کلام حشو وزوائد سے خالی نہ ہو اسے فصاحت وبلاغت کے معیار سے بہت فروتر سمجھتے تھے۔ اس طرح حذف ان کی فطری خصوصیات کا ایک لازمی جزو تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جواب شرط، جواب قسم غیرہ بہت سے ان نحوی قواعد کو حذف کر دیا جسے قرینہ سے سمجھا جا سکتا ہو۔ اور چوں کہ قرآن پاک امروالقیس، عمرو بن کلثوم اور نابغہ ذبیانی جیسے شعراء اور قس بن ساجدہ جیسے بلند پایہ خطیبوں کی ٹکسالی زبان میں نازل ہوا ہے اس لے حذف کے وہ تمام مواقع اس میں موجود ہیں جو اہل عرب کے یہاں مستعمل تھے اس لیے قرآن کے ایجاز واعجاز کا اندازہ کرنے کے لیے حذف کے اسلوب کو سمجھنا بھی ضروری ہے ورنہ ظاہر ہے کہ عام قاری یہ کیسے سمجھ سکے گا کہ قرآن کے اندر وہ کیا سحر ہے جس نے تمام فصیحوں اور بلیغوں کو ہمیشہ کے لیے عاجز ودرماندہ کر دیا۔

مواقع حذف:

حذف کے بہت سے مواقع ہیں۔ ان میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مضارع سے پہلے متصل ماضی کا حذف کر دینا مثلاً **کان یفعل** کی جگہ صرف **یفعل**

Marfat.com

کا استعمال۔ کلام عرب میں اس کی نظیریں بہت ہیں۔ چند اشعار بطور مثال درج ذیل ہیں:

متیّم بن نویرہ کہتا ہے: (۱۰۳)

تقول ابنة العمری مالك بعد ما — اراك قديما نائم الوجه أفرعا

(عمری کی صاحبزادی (غالباً شاعر کی بیوی مراد ہے) مجھ سے کہتی ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے جب کہ پہلے میں تم کو تر و تازہ اور بڑے بالوں والا جوان دیکھتی تھی)

یہاں أراك، كنت أراك کے معنی میں مستعمل ہے۔ لیکن كنت حذف کر دیا گیا ہے۔

اسی طرح خداش بن زہیر بن ربیعہ کہتا ہے: (۱۰۴)

قفار و قد ترعىٰ بها امّ رافع — مذ انبها بين الأسلة و الصخر

(اب وہ سارے مقامات صحراء میں تبدیل ہو چکے ہیں جب کہ ایک زمانہ وہ تھا جب ام رافع کی وجہ سے چٹانوں اور چشموں کے درمیان علاقے محفوظ تھے)

یہاں و قد ترعىٰ دراصل قد كانت ترعىٰ کے معنی میں ہے۔

اعشیٰ بن بکر بن وائل کہتا ہے:

فلئــن شطّ بــی المـــزار لقــد — اضحىٰ قليل الهموم ناعم بال (۱۰۵)

(اگر مجھ سے ملاقات دور ہو گئی تھی تو مجھے بھی اس کی کوئی پرواہ نہ تھی اور میں آسودہ حال تھا)

قطامی کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو:

كانت منازل مناقد نحلّ بها — حتى تغير دهر خائن خبل (۱۰۶)

(یہ وہ مقامات تھے جہاں ہم قیام کیا کرتے تھے یہاں تک کہ مکار اور دھوکا باز زمانہ بدل گیا)

قد نحل بها اصل میں قد كنّا نحل بها تھا۔ كنّا کو حذف کر دیا گیا تھا۔

قرآن پاک میں اس اسلوب کی مثالیں دیکھیے:

فَلاَ تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلاَءِ مَا يَعْبُدُوْنَ إِلاَّ كَمَا يَعْبُدُ آبَاءُ هُم مِنْ قَبْلُ (هود: ۱۰۹)

(پس تم ان چیزوں سے شک میں نہ پڑو جن کو یہ پوجتے ہیں۔ یہ ان چیزوں کو نہیں پوجتے مگر اس طرح جس طرح اس سے پہلے ان چیزوں کو ان کے باپ دادا پوجتے تھے)

اس آیت میں دیکھیے كما كان يعبد کے بجائے كما يعبد فرمایا۔ كان کو حذف کر دیا۔

Marfat.com

اسی طرح سورہ زخرف میں ہے:

وَ كَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَبِيٍّ فِی الأولين وَ مَا يَأْتِيهِمْ من نبيٍ الا كَانُوا به يَسْتَهْزِءُونَ۔ (زخرف : ۶-۷)

(اور ہم نے کتنے نبی بھیجے اگلوں میں اور نہیں آتا تھا کوئی نبی ان کے پاس مگر وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے)

اس میں و ما یاتھیم دراصل و ما کان یاتیھم تھا لیکن عربی اسلوب کے مطابق کان کو حذف کردیا۔

سورہ انعام میں ہے:

وَكَذَالِكَ نُرِی إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ۔ (انعام: ۷۵)

(اور اسی طرح ہم ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے اقتدار کا مشاہدہ کراتے تھے)

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ نُری ابراھیم دراصل کُنّا نُرِیْ إِبْرَاهِيمَ تھا۔ لیکن عام اسلوب کے مطابق مضارع سے پہلے "کنّا" حذف کردیا گیا ہے۔

سورہ بقرہ میں فرمایا:

قَدْ نَرَی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَاءِ (بقرہ: ۱۴۴)

(ہم آسمان کی طرف تمہارے رخ کی گردش دیکھ رہے تھے)

یہاں قد نریٰ دراصل قد کنّا نریٰ ہے۔

سورہ ہود میں ہے:

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا وَلاَ تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا إِنَّهُمْ مُغْرَقُونَ وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلأٌ مِنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوا مِنْهُ (هود: ۳۷-۳۸)

(اور تم کشتی بناؤ ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے مطابق اور ان ظالموں کے باب میں اب ہم سے کچھ نہ کہیو، یہ تو غرق ہو کر رہیں گے اور وہ کشتی بنانے لگا اور جب جب اس کی قوم کے بڑوں کی کوئی جماعت اس کے پاس سے گذرتی تو اس کا مذاق اڑاتی)

یہاں بھی اسی معروف اسلوب کے مطابق يَصْنَعُ سے پہلے جَعَلَ فعل ماضی محذوف ہے۔

Marfat.com

۲۔ عام طور سے مشابہ فعل کے بعد فعل محذوف ہو جاتا ہے کیوں کہ سامع قرائن سے سمجھ لیتا ہے۔ابو عطاء السندی، ابن ہبیرہ کا مرثیہ کہتے ہوئے نوحہ خوانی کرتا ہے:

عشیّۃَ قامَ النائحات و شقّقَت جیوبٌ بأیدی ماتم و خدودُ (۱۰۷)

(اور وہ آنکھ بھی بخیل ہے جو اس رات کو نہ روئے جب کہ نوحہ کرنے والی عورتیں ماتم کے لیے تیار ہوگئیں۔ان کے گریبان تار تار ہوگئے اور رخسار طمانچوں سے لہولہان ہوگئے)

یہاں اصل میں شققت جیوبٌ و لطمت خدودٌ تھا لیکن لُطِمَتْ کو حذف کردیا کیوں کہ اس سے پہلے مشابہ فعل شُقّقت موجود تھا جو محذوف پر دلالت کر رہا تھا۔

اس اسلوب کو قرآن نے بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔چند مثالیں دیکھیے:

وَالَّذِیْنَ تَبوّءُوا الدَّارَ وَ الإِیْمَانَ مِنْ قَبْلِھِمْ (حشر: ۹)

(اور جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ایمان لاکر دارالہجرت میں مقیم تھے)

یہاں پوری عبارت یوں تھی "تبوّءوا الدَّارَ وَ أحْکَمُوا الإیْمَانَ (یعنی جنھوں نے پہلے سے دارالہجرت میں اقامت اختیار کر رکھی ہے اور اپنے ایمان کو بھی مضبوط کر رکھا ہے) لیکن أحکموا کو حذف کردیا گیا کیوں کہ قرینہ سے مفہوم سمجھ میں آرہا تھا۔

ایک دوسرے مقام پر قرآن کہتا ہے:

وَ أَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ وَ اَنْھَارا و سُبُلاً لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ (نحل: ۱۵)

(اور اس نے زمین میں پہاڑ ڈال دیے ہیں کہ وہ تمہیں لے کر جھک نہ پڑے اور نہریں جاری کردی ہیں اور راستے نکال دیے ہیں تاکہ تم راہ پاؤ)

یہاں اصل عبارت یوں تھی فَجرّ فیھا انھاراً و مَدَّ فیھا سُبلاً لیکن چوں کہ یہ افعال بغیر اظہار کے ظاہر تھے اور أَلقیٰ ان محذوفات کی پردہ کشائی کر رہا تھا اس لیے انھیں حذف کردیا گیا۔

سورۂ نساء میں ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَ لاَ تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَ بِالْوَالدینِ احسانًا۔ (۳۶)

(تم سب اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو)

Marfat.com

یعنی اُعْبُدُوا اللّٰہَ و اَحْسِنُوْا بِالوَالِدَیْنِ

ایک اور مقام پر قرآن کہتا ہے:

نَدْعُ أَبْنَاءَ نَا وَ أبناءَ کُمْ وَ نِسَاءَ نَا وَ نِسَاءَ کُمْ وَ أَنْفُسَنَا وَ أَنْفُسَکُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلُ فَنَجْعَلُ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ (آل عمران: ۶۱)

(ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو جمع کریں تم اپنی عورتوں کو جمع کرو ہم اپنے آپ کو اکٹھا کریں تم اپنے آپ کو اکٹھا کرو، پھر ہم مل کر دعا کریں اور جھوٹوں پر لعنت بھیجیں)

اس آیت میں محذوفات کو اگر کھول دیا جائے تو پوری آیت یوں ہو گی: نَدْعُ نَحْنُ اَبْنَاءَ نَا وَ اَنْتُمْ اَبْنَاءَ کُمْ وَ نَحْضُرُ اَنْفُسَنَا وَ اَنْتُمْ اَنْفُسَکُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلُ نَحْنُ وَ اَنْتُمْ ۔

۳۔ جواب شرط یا جزاء اکثر حذف ہو جاتی ہے۔ خاص طور سے جب دلائل کا تذکرہ ہو۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار کا مطالعہ کیجیے:

عباس بن مرداس کہتا ہے:

فان اَكُ فِی شرارکم قلیلا فانی فی خیارکم کثیرٌ (۱۰۸)

(اگر میں تمہارے بروں کی نگاہ میں کمتر ہوں تو کوئی پروا نہیں کیوں کہ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے میں تمہارے اچھے لوگوں کی نگاہ میں باوقعت ہوں کیوں کہ میں انھیں میں شمار ہوتا ہوں)

یہاں اصل عبارت محذوفات کو کھولنے کے بعد یوں بنے گی۔ فان اك فی شرارکم قلیلا فلا أبالی به لانی لستُ منهم فانّی فی خیارکم کثیر فإنی منهم.

ایک دوسرا جاہلی شاعر تابط شرّاً کہتا ہے:

فلئن فلت هذیل شباه بما کان هذیلاً یفُلُّ (۱۰۹)

(اگر آج ہذیل کے ہتھیار کند ہو گئے ہیں تو کوئی افسوس کی بات نہیں ہے کیوں کہ یہ ہذیل تھا جو دوسروں کے ہتھیاروں کو کند بنادیا کرتا تھا)

اصل عبارت یوں تھی فلئن فلت هذیل شباه فلا أسفیٰ علیه لانه کان هذیلاً یفُلُّ

قرآن پاک میں اس سلوب کی مثالیں بہت ہیں۔ یہاں چند مثالیں نقل کی جارہی ہیں:

Marfat.com

سورہ زمر میں فرمایا:

إن تَكْفُرُوا فَإنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُم (زمر: ۷)

(اگر تم ناشکری کرو گے تو خدا تم سے بے نیاز ہے)

یہاں جزا محذوف ہے اصل عبارت یوں ہے۔ إن تكفروا فلن تضروا اللّٰهَ شَيْئًا لانّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عنكم یعنی اگر تم دوسروں کو خدا کا شریک بنا کر ناشکری کر رہے ہو تو خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اس لیے کہ وہ تمہارے کفر و شرک سے بے نیاز ہے۔ وہ تمہارا محتاج نہیں بلکہ تم اس کے محتاج ہو۔

یہی مفہوم سورۂ آل عمران میں اس طرح بیان ہوا ہے:

و مَنْ يَنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا (آل عمران: ۱۴۴)

(اور جو پیٹھ پیچھے پھر جائے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا)

سورۂ زمر ہی کی آیت ہے:

أفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْإسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُورٍ مِنْ رَّبِّهٖ فَوَيْلٌ لِلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ اولٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ ـ (زمر: ۲۲)

(کیا وہ جن کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے پس وہ اپنے رب کی طرف سے روشنی پر ہیں (اور وہ جن کے دل سخت ہو چکے ہیں یکساں ہوں گے؟) تو ہلاکی ہے ان کے لیے جن کے دل اللہ کی یاد دہانی قبول کرنے کے معاملے میں سخت ہو چکے ہیں! یہی لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں)

یہاں اگر محذوف کو کھول دیا جائے تو عربی عبارت یوں بنے گی أفَمن شرح الله صدره لِلْإسْلَامِ فهو على نورٍ من ربّه يستوى من قسى قلبه فويل للقاسية قلوبهم۔ جزا حذف ہو گئی ہے۔

اس مفہوم کی وضاحت اسی سورہ میں پیچھے آ چکی ہے۔ فرمایا:

فَهَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لاَ يَعْلَمُوْنَ إنَّمَا يَتَذَكَّرُ أولوا الْألْبَابِ(۹)

(پس کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے ہیں برابر ہو جائیں گے۔ تذکر تو صرف عقل والے حاصل کرتے ہیں)

سورہ فاطر میں ہے:

Marfat.com

وَ إِن يُّكَذِّبُوك فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ (فاطر : ۴)

(اور اگر یہ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو کچھ غم نہ کرو، تم سے پہلے بھی کتنے رسولوں کی تکذیب کی گئی ہے)

یہاں محذوف کو کھول دینے کے بعد اصل عبارت یوں ہو گی وَ اِنْ يُّكَذِّبوك فَلاَ تحزن لانه قد كذبت رسلٌ من قبلك۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ سر پھرے تمہاری تکذیب کر رہے ہیں تو یہ کوئی تعجب یا غم کی بات نہیں ہے۔ تم سے پہلے جو رسول آئے ان کی بھی تکذیب کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں تمہاری کسی کوتاہی کو دخل نہیں ہے بلکہ تمام تر دخل ان مکذبین کی مخصوص ذہنیت کا ہے۔

سورہ تحریم میں ہے:

وَ إِنْ تَتُوبَا اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا وَ اِنْ تَظَاهرا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَولاَهُ وَ جِبْرِيْلُ وَ صَالِحُ المُومنين (۴)

(اگر تم دونوں اللہ کی طرف رجوع کرو تو یہی تمہارے لیے زیبا ہے۔ تمہارے دل تو خدا کی طرف مائل ہی ہیں (۱۱۰) اور اگر تم اس کے خلاف ایکا کرو گی تو اس کا حامی اللہ ہے جبریل اور نیکوکار مسلمان اس کے ساتھ ہیں)

یہاں محذوف کو کھول دیا جائے تو اصل عبارت یوں ہو گی۔ و إِنْ تَتُوبَا إلى اللّٰه فهذا أجدىٰ بكما لانه قد صغت قلوبكما و ان تظاهرا عليه فلا يضرا نه لِأَنَّ اللّٰه هو مولاه۔ یعنی تم اگر اللہ کی طرف رجوع کرو تو یہی بات تمہارے شایان شان ہے اس لیے کہ تمہارے دل تو اللہ کی طرف جھکے ہوئے ہیں ہی اور اگر تم نے رسول کے خلاف محاذ بنایا تو یاد رکھو کہ رسول اپنی دلجمعی کے لیے تمہارا محتاج نہیں بلکہ اس کی طمانیت کے لیے اللہ، جبریل اور مومنین صالحین کی معیت و رفاقت کافی ہے۔

سورہ نساء میں فرمایا:

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيمًا (نساء: ۱۲۷)

(اور جو مزید بھلائی تم کرو گے تو اللہ اس سے باخبر ہے)

عبارت کھول دی جائے تو یوں ہو گی وَ مَا تفعلوا من خير تجدوه عند اللّٰه فان الله كان به عليماً یعنی جو کچھ بھی نیکی تم کرو گے اللہ کے یہاں اس کا بھرپور بدلہ پاؤ گے

Marfat.com

کیوں کہ وہ ہر ایک کے عمل کی خبر رکھتا ہے۔

۴۔ اگر قرینہ موجود ہو تو شرط اور جواب شرط کا ایک ساتھ حذف کر دینا۔ مثال کے طور پر سورہ نساء میں فرمایا:

أَيَبْتَغُونَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ العزة لِلّٰهِ جميعًا (نساء: ۱۳۹)

(کیا یہ لوگ ان کے یہاں عزت ورسوخ چاہتے ہیں۔ عزت تو سراسر اللہ کے لیے ہے)

پوری عبارت یوں ہے أ يبتغون عندهم العزة إن يبتغوا العزة عندهم لن يجدوها فإن العزة للّٰهِ جميعًا ۔ یعنی کیا یہ منافق یہودیوں کے یہاں عزت و سرخروئی حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں؟ اگر یہ یہود کے یہاں عزت حاصل کرنے کی کوشش کریں گے تو انہیں مایوسی ہوگی کیوں کہ عزت وذلت سب خدا کے اختیار میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔

یہاں قرینہ کی موجودگی میں شرط اور جواب شرط دونوں محذوف ہو گئے ہیں۔

۵۔ اگر تکرار سے عیب پیدا ہو رہا ہو تو اس مکرر لفظ کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیات کا مطالعہ کیجیے:

فَإِنْ يَّكُنْ مِنْكُمْ مأةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِأَتَيْنِ وَ إِنْ يَّكُنْ مِنْكُمْ اَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ مَعَ الصَّابِرِينَ (انفال: ٦٦)

(اگر تمہارے سو ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر ہزار ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر بھاری ہوں گے اور اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے)

اس آیت میں وان يكنْ منكم اصل میں أَلفٌ صَابِرٌ تھا پہلے جملے میں صَابِرَةٌ کا تذکرہ ہو چکنے کے بعد اس کو یہاں دوبارہ نہیں لایا گیا بلکہ آگے واللہ مع الصابرین کہہ کر اس کی وضاحت کر دی گئی۔

اسی طرح سورۂ بقرہ میں فرمایا:

وَ تَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّاد التَّقْوىٰ (بقرہ: ۱۹۷)

یہاں اصل میں وَ تَزَوَّدُوا التَّقْوىٰ تھا یعنی سفر حج کے لیے نکلو تو تقویٰ کا زاد راہ لے کر نکلو کیوں کہ بہترین زاد راہ تقویٰ ہے۔ پہلی جگہ بلاغت کے تقاضے کے تحت تقوی کے لفظ کو حذف

Marfat.com

کر دیا اس لیے کہ آگے اس کا اظہار ضروری تھا اگر پہلے مقام میں اس کا اظہار کر دیا جاتا تو اس میں تکرار کا عیب پیدا ہو جاتا۔

۶۔ بل سے پہلے انکاریہ جملہ حذف کر دیا جاتا ہے کیوں کہ بل خود ہی انکار پر دلالت کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا كَذَالِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا بَلْ كَانُوا لاَ يَفْقَهُونَ إِلاّ قَلِيْلاً (فتح: ۱۵)

(کہہ دو تم ہمارے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے یہی بات تو اللہ نے تم کو پہلے بھی فرمائی تھی، تو وہ کہیں گے کہ بلکہ تم لوگ ہم پر حسد کرتے ہو بلکہ یہی لوگ بہت کم سمجھتے ہیں)

اس آیت میں بل تحسدوننا سے پہلے لم يَقُلِ اللهُ اور بَلْ كَانُوْا لاَ يَفْقَهُونَ إِلا قَلِيلاً سے پہلے لا يقولون بعلم محذوف ہے یعنی وہ لوگ کہیں گے کہ اللہ نے یہ باتیں نہیں کہی ہیں بلکہ تم لوگ خود حسد کرتے ہو اور دوسرے جملے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اس طرح کی باتیں علم واستدلال کی روشنی میں نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ ان کے پاس علم وشعور نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

۷۔ قرینہ موجود ہو تو معطوف علیہ حذف ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ آل عمران میں فرمایا:

قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلٰى مَضَاجِعِهِمْ وَ لِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِي صُدُوْرِكُمْ وَ لِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ (آل عمران: ۱۵۴)

(کہہ دو اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے جب بھی جن کا قتل ہونا مقدر تھا وہ اپنی قتل گاہوں تک پہونچ کر رہتے۔ یہ اس لیے ہوا کہ اللہ تمہاری آزمائش کرے جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اسے پرکھے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو صاف کرے)

یہاں وَ لیبتلی اللہ کا معطوف علیہ لیمتحن المومنین محذوف ہے یعنی اللہ کے رسول کے ہاتھوں انہیں جانی ومالی نقصان اس لیے ہوا تاکہ مومنین ومنافقین کی آزمائش ہو سکے اہل ایمان کا درجہ بلند ہو اور منافقوں کے دلوں میں یہ حسرت کا کانٹا بنے اور ان کی کمزوریاں ابھر کر سامنے آجائیں۔

Marfat.com

۸۔ دو مقابل جملوں میں سے ہر ایک سے ایک یا چند الفاظ کا حذف کر دینا جب کہ اس کا مقابل محذوف کی طرف رہنمائی کر رہا ہو۔ مثال کے طور پر سورہ آل عمران میں فرمایا:

فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَ أُخْرَىٰ كَافِرَةٌ (آل عمران: ۱۳)

(ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا۔ دوسرا گروہ کافر تھا)

اگر اس آیت کے محذوفات کو کھول دیا جائے تو پوری عبارت یوں ہو گی! **فِئَةٌ مُّومِنَةٌ تُقَاتِلُ فی سبیل اللّٰهِ و اُخریٰ کافِرَةٌ تقاتل فی سبیل الطاغوت** فقرے کے پہلے حصے سے لفظ مومنة کو حذف کر دیا اور دوسرے میں **تقاتل فی سبیل الطاغوت** کو اس لیے کہ دوسرے میں کافرةٌ کی صفت پہلے میں مومنةٌ کی خبر دے رہی ہے اور پہلے میں **فی سبیل الله** کا حوالہ دوسرے میں **فی سبیل الطاغوت** کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

سورۃ نحل میں ہے:

فَأَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَ الْخَوْفِ۔ (نحل : ۱۱۲)

(پس اللہ نے ان کو بھوک اور خوف کا مزہ چکھایا)

اگر اس جملے کو کھولا جائے تو یوں ہو گا **فَأَذَاقَهَا اللّٰهُ طُعْمَ الْجُوعِ وَ اَلْبَسَهَا لِبَاسَ الْخَوفِ.** فقرہ کے آغاز سے لفظ "طعم" کو حذف کر دیا اور آخری فقرے سے فعل **اَلْبَسَهَا** کو کیوں کہ فعل اذاقها لفظ "طعم" کا پتا دے رہا تھا اور لفظ لباس **اَلْبَسَهَا** کی ضرورت کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

سورہ یونس میں ہے:

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا (یونس:۶۷)

(وہی ہے جس نے رات کو تمہارے لیے تاریک بنایا تاکہ اس میں آرام کرو اور دن کو روشن بنایا تاکہ تم اس میں معاش کے لیے جدوجہد کرو)

یہاں بھی محذوفات کو کھولنے کے بعد پورا جملہ اس طرح بنے گا: **جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ مُظْلِمًا لِتَسْكُنُوا فِيْهِ والنهار مُبْصِرًا لِتَبْتَغُوْا فِيْهِ** فرمایا وہی خدا ہے جس نے تمہارے لیے شب کو تاریک اور خنک بنایا تاکہ اس میں آرام کرو اور دن کو روشن بنایا تاکہ اس میں کام کرو اور معاش کے لیے جدوجہد کرو۔

اس اسلوب کی کارفرمائی مندرجہ ذیل آیت میں بھی دیکھیے:

Marfat.com

وَ جَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (النباء :۱۰-۱۱)

(اور رات کو تمہارے لیے پردہ اور دن کو وقت معاش بنایا)

اصل عبارت یوں ہے و جَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا وَّ سُكُونًا وَ جَعَلْنَا النَّهَارَ ضِيَاءً وَّ مَعَاشًا

سورہ ابراہیم میں ہے:

كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (ابراهيم: ۲۴)

(اس اچھی ذات کے درخت کی طرح جس کی جڑیں زمین میں گڑی ہوئی ہوں اور شاخیں آسمان تک پہونچی ہوئی ہوں)

یہاں پہلے جملے میں ثابت" کا لفظ ظاہر فرمایا تو دوسرے جملے میں فرعُهَا کے بعد اس کا مقابل لفظ عالٍ یا اس کا ہم معنی کوئی لفظ حذف کر دیا اسی طرح دوسرے جملے میں فِي السَّمَاءِ کو ظاہر فرمایا تو پہلے ٹکڑے میں ثابتٌ کے بعد فِي الأرضِ حذف کر دیا۔ ان محذوفات کو کھولنے کے بعد اس کا ترجمہ یہ ہوگا۔ اس کی جڑ زمین کی تہوں میں اتری ہوئی اور اس کی شاخیں فضائے آسمانی میں پھیلی ہوئی ہیں۔

سورہ انعام میں ہے:

وَ مَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الأَرْضِ وَ لاَ طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلاَّ أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ (۳۸)

(زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو یہ سب تمہاری ہی طرح کے انواع ہیں)

جملے کے پہلے حصہ میں فِي الأَرْضِ کا لفظ دوسرے حصے کے محذوف فِي السَّمَاءِ کو کھول رہا ہے اسی طرح دوسرے حصے کے يطير بجناحيه کے الفاظ پہلے حصے میں تَدُبُّ عَلٰى أَرْجُلِهَا کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

سورہ نساء کی مندرجہ ذیل آیت دیکھیے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَ الآخِرَةِ (۱۳۴)

(جو شخص دنیا کے صلے کا طلب گار ہے تو اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کا صلہ موجود ہے)

اس آیت کے محذوفات کھول دیے جائیں تو کلام کی ترتیب یہ ہوگی۔ من كان يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوابُ الدُّنيا وَ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الآخرةِ فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا

Marfat.com

وَالآخرةِ . یعنی جو شخص دنیا ہی کے صلے کا طالب ہوتا ہے تو دنیا کا مالک خدا ہی ہے وہ اس میں جس کو جتنا چاہتا ہے دیتا ہے اور جو آخرت کا طالب ہوتا ہے تو اللہ اس کو دنیا میں بھی جو چاہتا ہے دیتا ہے اور اسے آخرت کا صلہ بھی بھرپور عطا فرمائے گا۔ یہاں پہلے ٹکڑے سے فعند اللّٰہ ثواب الدنیا کو اور دوسرے میں سے من کان یرید ثواب الآخرةِ کو حذف کر دیا ہے کیوں کہ دونوں ٹکڑوں کے مذکور جملے محذوف کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

کلام عرب میں اس اسلوب کی مثالیں بہت ہیں۔ چند اشعار درج ہیں:

حارث بن حلزہ کہتا ہے:

وَالْعَيْشُ خَيْرٌ فِي ظلال النوك مِمَّن عَاش كدًّا (۱۱۲)

(حماقت کے سائے میں آرام دہ زندگی اس سخت کوش زندگی سے بہتر ہے جو عقل و دانش کے سائے میں بسر ہو)

اصل عبارت یوں ہے العيش فی الرفاهية مع الحمق خيرٌ من العيش فی الكدِّ مع العقل پہلے حصے سے فی الرفاهية کو اور دوسرے حصے سے مع العقل کو حذف کر دیا کیوں کہ کد اپنے بالمقابل لفظ "رفاهية" کو اور "نوك" عقل کو بتا رہا تھا۔

عمرو بن معدی کرب زبیدی کہتا ہے:

لیس الجمال بمئزرٍ فاعلم و ان رُدِّيتَ بُردًا (۱۱۳)

(خوبصورتی لباس سے نہیں آتی چاہے یمنی شال ہی آپ پہن لیں)

یعنی محذوف کو کھول دینے کے بعد عبارت اس طرح ہوگی لیس الجمال ببردٍ و مئزرٍ و إن رديت و ائتَزَرْتَ .

۹۔ حرف جر کے متعلق فعل کو حذف کر دیا جاتا ہے اور حرف جر اس مقدر پر دلالت کرتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کی مندرجہ ذیل آیات دیکھیں:

حَقِيقٌ عَلٰى أَلاَّ أَقُولَ عَلَى اللّٰهِ إلا الحق (اعراف: ۱۰۵)

(میں سزاوار اور حریص ہوں کہ اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی اور بات منسوب نہ کروں)

یہاں تضمین ہے اصل عبارت تھی حقيقٌ و حريصٌ عَلٰى أَلاَّ أقولَ اس طرح گویا اصل مفہوم کے اندر ایک اور اضافہ ہو گیا جس کی صراحت ترجمہ میں ہو گئی ہے۔ یہاں علیٰ حرف جر بتا رہا

Marfat.com

ہے کہ حریصٌ محذوف ہے کیوں کہ حَقِیْقٌ کے ساتھ علیٰ کا استعمال نہیں ہوتا۔

اسی سورہ کی ایک دوسری آیت ہے:

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسٰى بِآيَاتِنَا إِلٰى فِرْعَونَ وَ مَلَائِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا(۱۰۳)

(پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان کے پاس رسول بنا کر بھیجا تو انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم اور نشانیوں کا انکار کیا)

قرآن میں ظَلَمُوا کے ساتھ جہاں جہاں "ب" کا صلہ آیا ہے وہاں یہ لفظ کَفَرُوا اور جَحدُوا وغیرہ کے معنی پر متضمن ہے یعنی انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اللہ کی آیات کا انکار کر دیا۔ یہاں ترجمہ میں یہ مضمر مضمون کھول دیا گیا ہے۔

سورہ طلاق میں ہے:

و كَأَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا و رُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا (طلاق : ۸)

(اور کتنی ہی بستیاں ایسی ہوئی ہیں جنھوں نے اپنے رب کے حکم اور اس کے رسولوں سے سرکشی کی تو ہم نے ان کا سخت محاسبہ کیا اور ان کو نہایت ہولناک عذاب دیا)

یہاں عَتَتْ عَنْ أمر رَبِّهَا میں "عن" اس امر کا قرینہ ہے کہ یہاں عَتَتْ أَعْرَضَتْ کے مفہوم پر متضمن ہے اور پوری عبارت یوں ہے و كَأَيِّن من قرية عَتَتْ وَ أَعْرَضَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا یعنی سرکشی کے سبب سے انھوں نے اپنے رب کے حکم سے اعراض کیا تو ہم نے ان کی سخت گرفت کی اور انھیں ہولناک عذاب کا لقمہ بنا دیا۔

عربی ادب میں یہ اسلوب بہت مانوس ہے ایک حماسی شاعر کہتا ہے:(۱۱۴)

عجبت لمسراها و أنّى تخلصت إلىّ و باب السجن دونى مغلقٌ

(میں اس کی آمد پر متحیر ہوا تھا لیکن وہ جیل کے دروازے سے گذر کر مجھ تک کیسے پہنچ سکتی ہے جب کہ قید خانے کے دروازے بند ہیں)

یہاں تخلصت الیّ اس امر کا قرینہ ہے کہ تخلصت یہاں وَصَلَتْ کے مفہوم پر متضمن ہے یہاں اصل عبارت یوں ہے انّى تخلصت من باب السجن و وصلت إلىّ .

Marfat.com

حضرت حسانؓ بن ثابت کہتے ہیں:

هُمُ جبل الإسلام والناس حوله رضام الى طود يروق و يقهر(۱۱۵)

(یہ لوگ اسلام کے پہاڑ تھے اور ان کے ارد گرد رہنے والے لوگ پتھر تھے جو ایک ایسے ٹیلے کا سہارا لیے ہوئے تھے جو جمال و رعنائی کا پیکر تھا اور جلال و شکوہ کا مجسمہ بھی تھا)

یہاں رضامٌ إلى طودٍ میں رضامٌ کے بعد مسندۃٌ محذوف ہے جس پر حرف جرالی دلالت کر رہا ہے چوں کہ وہ قرینہ سے سمجھا جا رہا تھا اس لیے تقاضائے بلاغت کے تحت اسے حذف کر دیا گیا۔

۱۰۔ قرینہ موجود ہو تو جواب قسم حذف ہو جاتا ہے۔ سورہ قٓ میں ہے:

قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيْدِ بَلْ عَجِبُوا أَنْ جَاءَ هُمْ مُنْذِرٌ مِّنْهُمْ فقال الْكَافِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ (قٓ : ۱-۲)

(یہ سورہ قٓ ہے۔ قسم ہے باعظمت قرآن کی بلکہ ان لوگوں کو تعجب ہوا کہ ان کے پاس انھیں کے اندر سے ایک آگاہ کرنے والا آیا تو کافروں نے کہا کہ یہ تو ایک نہایت عجیب بات ہے)

یہاں جواب قسم قرآن مجید کی صفت کے اندر مضمر ہے لیکن محذوف ہے۔ پوری عبارت یوں ہے قٓ والقرآن المجيد إنهٗ لَحَقٌّ یعنی جو لوگ قرآن کے انذار قیامت کو یہ بہانہ بنا کر نظر انداز کر رہے ہیں کہ یہ وحی الٰہی نہیں بلکہ وحی شیطانی ہے۔ ان کی تردید کے لیے قرآن مجید کی معجزانہ بلاغت ہی کافی ہے۔ یہ کتاب خود شہادت دیتی ہے کہ یہ وحی الٰہی ہے اس کے لیے کسی خارجی دلیل کا لانا اس کی حقانیت اور بدیہیت پر پردہ ڈالنا ہے۔ یہ لوگ قرآن کے اس وجہ سے منکر ہیں کہ ان کی نظر میں یہ بات عجیب ہے کہ اس کی خبر دینے والا انھیں کے اندر کا ایک آدمی ہے۔

سورہ صٓ میں ہے:

صٓ وَالْقُرْآنِ ذِى الذِّكْرِ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فى عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ (صٓ:۱-۲)

(یہ سورہ صٓ ہے۔ قسم ہے یاد دہانی سے معمور قرآن کی (کہ اس کی ہر بات حق ہے) بلکہ جن لوگوں نے اس کا انکار کیا وہی گھمنڈ اور مخاصمت میں مبتلا ہیں)

یہاں جواب قسم جو مقسم بہ کی صفت میں مذکور ہے محذوف ہے یعنی قرآن جن آیتوں سے مزیّن ہے اور اس میں جس قسم کی یاد دہانی موجود ہے وہ اس بات پر شاہد ہے کہ آج قریش کو جن

Marfat.com

باتوں کی تذکیر کی جارہی ہے وہ بالکل نا قابل انکار ہیں اگر وہ ان کو نہیں مان رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ قرآن کے اندر کسی ریب و شک کی گنجائش ہے بلکہ اس کا سبب محض ان کی انانیت اور مخاصمت ہے۔

یہاں یہ نکتہ قابل لحاظ ہے کہ جہاں کہیں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ مخاطب ہوشیار ہو کر انکار کا ترکش سنبھالے گا وہاں جواب قسم کو حذف کر دیا جاتا ہے اور صرف مقسم بہ پر اکتفا کر کے اس کے بعد کوئی ایسی بات لائی جاتی ہے جو محذوف پر دلیل ہو تاکہ مخاطب کو اتنی فرصت ہی نہ ملے کہ وہ انشاء کو خبر کی صورت میں ڈھال کر اس کی تردید و انکار کے لیے آمادہ ہو اس کی مثال اوپر کی دونوں آیات ہیں۔

سورۂ فجر میں ہے:

وَالْفَجْرِ وَ لَيَالٍ عَشْرٍ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ وَاللَّيْلِ اِذَا يَسْرِ (فجر: ۱-۴)

(قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور جفت و طاق کی اور رات کی جب وہ رخصت ہو رہی ہو)

اس کے بعد إنّ الدين لواقعٌ جواب قسم محذوف ہے یعنی یہ صبح کا پو پھٹنا، آخری دس راتوں میں چاند کا دھیرے دھیرے باریک سے باریک تر ہو جانا پھر پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہونا اور جفت و طاق مہینے کے ایام سب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ایک دن حساب کا ضرور آئے گا۔

سورہ نازعات میں دیکھیے:

وَالنّٰزِعَاتِ غَرْقًا وَّ النّٰشِطَاتِ نَشْطًا وَّ السّٰبِحٰتِ سَبْحًا فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا فَالْمُدَبِّرَاتِ أمرًا ۔(۱-۵)

(قسم ہے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے والی ہواؤں کی اور قسم ہے آہستہ چلنے والی ہواؤں کی اور قسم ہے فضاؤں میں تیرنے والے بادلوں کی پھر ایک دوسرے پر سبقت کرنے والے اور خدا کے حکم نازل کرنے والے بادلوں کی، کہ جس چیز سے تمہیں ڈرایا جارہا ہے شدنی ہے)

یہاں بھی جواب قسم محذوف ہے اگر اسے کھول دیں تو اوپر کے جملوں کے بعد إنّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ جواب مذکور ہوگا گویا تند اور نرم ہواؤں اور بادلوں کے عجائب تصرفات کو شہادت میں پیش کر کے قریش کو آگاہ کیا گیا ہے کہ تمہیں عذاب سے ڈرایا جارہا ہے اس کو ناممکن نہ سمجھو۔

۱۱۔ کبھی کبھی جواب قسم سے پہلے لاَ حذف ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ یوسف میں ہے:

Marfat.com

وَاللّٰهِ تَفْتَأُ تَذْكُرُ يُوسُفَ حَتّٰى تَكُونَ حَرَضًا أَوْ تَكُونَ مِنَ الْهَالِكِيْنَ (یوسف: ۸۵)

(بخدا آپ یوسف ہی کی یاد میں رہیں گے یہاں تک کہ ازکار رفتہ ہو کے رہ جائیں گے یا ہلاک ہی ہو جائیں گے)

یہاں تفتأ اصل میں لاَ تَفْتَأُ تھا لاَ حذف ہو گیا ہے۔

عربی شاعری میں یہ اسلوب بہت استعمال ہوا ہے۔ امرءالقیس کہتا ہے:

فقلت يمين اللّٰه أبرح قاعدًا ولو قطعوا راسی لديك و أوصالی (۱۱۶)

(میں نے کہا بخدا میں تیرے حضور موجود رہوں گا چاہے لوگ میرا سر تن سے جدا کر دیں اور میرے عضو عضو الگ کر دیں)

یہاں أبْرحُ اصل میں لا أبرحُ تھا۔ اسی اسلوب کے مطابق لاَ حذف ہو گیا ہے۔

حضرت حسان بن ثابتؓ کا شعر ہے:

وَاللّٰهِ أسْمَعُ مَا بَقِيْتُ بِهَالِكٍ إلاَّ بكيتُ عَلَى النبی محمّد (۱۱۷)

(بخدا میں اپنی زندگی میں جب بھی کسی مرنے والے کا تذکرہ سنوں گا محمد ﷺ کی وفات پر آنسو بہانا میرے لیے ضروری ہو گا)

یہاں دراصل وَاللّٰهِ لاَ أسْمَعُ تھا لیکن قسم کے بعد لاَ حذف ہو گیا ہے۔

۱۲۔ اگر دو جملے ایک دوسرے کی وضاحت کے لیے آئیں اور دونوں نہی پر مشتمل ہوں تو دوسرے جملے سے لاَ کو حذف کر دیتے ہیں دونوں ہی جملوں میں ایک ہی حقیقت کو ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ پہلی بات کے بعد دوسری بات محض ایک بیان اور وضاحت کی حیثیت رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات دیکھیے:

وَلاَ تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (بقرہ:۴۲)

(اور حق اور باطل کو گڈمڈ نہ کرو حق کو چھپانے کے لیے دراں حالیکہ تم جانتے ہو)

چونکہ حق اور باطل کو گڈمڈ کرنے کی کوشش سے حق کو چھپانا مقصود ہے اس لیے عطف کیا اور وہ بھی بغیر لا کے، یہ بتانے کے لیے کہ یہود تلبیس کی جو پالیسی اپنائے ہوئے ہیں اس کا مقصد محض کتمان حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے پہلے حق و باطل کو گڈمڈ کرنے سے روکا جو

Marfat.com

در حقیقت حق و باطل کے التباس کی کوشش کا اصل مقصود و مدعا تھا۔

اسی سورہ میں آگے فرمایا:

وَلاَ تَاْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ (بقرہ: ۱۸۸)

(اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ اور نہ اس کو حکام رسی کا ذریعہ بناؤ)

اصل میں وَلاَ تُدْلُوا بِهَا تھا لیکن چوں کہ دوسرا فقرہ پہلے فقرے کی وضاحت کر رہا ہے اس لیے صرف لا کے اعادہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

اسی طرح سورہ انفال میں ہے:

وَلاَ تَخُونُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ وَ تَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَ أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ

(انفال:۲۷)

(اللہ اور رسول سے بے وفائی اور اپنی امانتوں میں خیانت جانتے بوجھتے نہ کرو)

یہاں بھی دوسرا جملہ پہلے جملے کے تحت ہے لیکن صرف نہی کا اعادہ نہیں فرمایا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ اور رسول سے خیانت ہی ہے جو لوگوں کے لیے اپنی امانتوں اور ذمہ داریوں میں خیانت کے لیے راہ کھولتی ہے۔

اسی طرح سورہ محمد میں دیکھیے:

فَلاَ تَهِنُوا وَ تَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ و أَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَ لَنْ يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ (محمد : ۳۵)

(پس تم کمزور نہ پڑو اور سمجھوتے کی دعوت نہ دو اور تم ہی غالب رہو گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کے باب میں تمہارے ساتھ کوئی خیانت نہیں کرے گا)

یہاں معطوف اور معطوف علیہ دونوں میں ایک ہی حقیقت ظاہر کی گئی ہے اس لیے لاء نہی کے اعادہ کی ضرورت نہیں پڑی۔ منافقین چوں کہ جنگ کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے اور بزدل تھے اس لیے صلح اور سمجھوتے کی باتیں بہت کرتے تھے اور جہاد و قتال سے گریز کرتے تھے۔ فرمایا کہ ان کی یہ پالیسی تمام تر ان کی بزدلی اور مفاد پرستی پر مبنی ہے لیکن وہ اس کی دعوت صلح پسندی اور امن دوستی کے روپ میں دیتے ہیں اسی وجہ سے تدعو کو فلا تَهِنُوا پر عطف کر دیا اور لا کو حذف کر دیا تاکہ

Marfat.com

اسلوب کلام ہی سے یہ بات واضح ہو جائے کہ یہ دعوت صلح ان کی بزدلی پر پردہ ڈالنے کی ایک ناکام سعی ہے۔ یہاں ایسے ہی منافقوں کی خبر لی گئی ہے اور انھیں ڈانٹا گیا ہے کہ بزدلی نہ دکھاؤ، صلح اور سمجھوتے کے داعی نہ بنو بلکہ عزم و ایمان کے ساتھ جہاد کے لیے اٹھو اگر تم جہاد پر کمر بستہ ہو جاؤ گے تو تمہی سر بلند رہو گے۔

۱۳۔ کلام عرب میں جب کلام کا آغاز إذ سے ہوتا ہے تو اس سے پہلے اُذکُر یا اس کے ہم معنی کسی فعل کو حذف کر دیا جاتا ہے یعنی خیال کرو، تصور کرو، یاد کرو عموماً اس کے بعد کسی ایسی ہی سر گذشت یا واقعہ کا حوالہ آتا ہے جو یا تو مخاطب کے علم میں ہو یا خود متکلم اس کی قطعیت پر اس درجہ مطمئن ہو کہ ایک معلوم و معروف حقیقت کی حیثیت سے اس کا حوالہ دے سکے۔ مثال کے طور پر سورہ بقرہ میں فرمایا:

وَ إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلاَئِكَةِ إِنِّی جَاعِلٌ فی الأَرْضِ خَلِيْفَةً. (بقرہ: ۳۰)

(اور یاد کرو اس وقت کو جب تمہارے رب نے کہا فرشتوں سے کہ میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں)

اصل عبارت یوں تھی وَاذْكُرُوا إِذْ قَالَ ترجمہ میں محذوف عبارت کو ہم نے کھول دیا ہے۔ یہاں سر گذشت کا اصلی رخ یہود کی طرف ہے اور وہ تورات کے ذریعہ اس ماجرے سے اچھی طرح واقف تھے۔ قرآن پاک میں یہ اسلوب بہت استعمال ہوا ہے۔ ایک حماسی شاعر کہتا ہے:

إِذْ أَسْحَبُ الرَّيْطَ وَالْمُرُوطَ إِلیٰ ادنیٰ تجاری و أنفض اللِّمَما (۱۱۸)

(یاد کرو میرے لہو و لعب کے اس زمانے کو جب میں اپنی چادریں گھسیٹتے قریب کے شراب خانے میں جاتا تھا اور زلفوں کو لہراتا تھا)

یہاں إذ سے پہلے أذكُرُوا محذوف ہے۔

۱۴۔ کلام کا ایک نہایت اہم اسلوب معانی کا حذف کرنا ہے یعنی درمیان سے گفتگو کا وہ حصہ حذف کر دیا جاتا ہے جسے قرینہ سے سمجھا جا سکتا ہو۔ مثال کے طور پر سورہ یوسف کا مطالعہ کیجیے۔ شاہی ساقی جیل سے چھوٹ کر بادشاہ کی خدمت میں لگ جاتا ہے اور ایک مدت کے بعد جب بادشاہ خواب دیکھتا ہے تو درباری تعبیر بتانے سے عاجز رہ جاتے ہیں ایسے موقع پر قرآن کہتا ہے:

وَقَالَ الَّذِی نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيْلِهِ فَأَرْسِلُونِ

Marfat.com

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِی سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ (یوسف: ۴۵-۴۶)
(ان دو قیدیوں میں سے جو شخص بچ گیا تھا اور اسے ایک مدت دراز کے بعد اب بات یاد آئی، اس نے کہا میں آپ حضرات کو اس کی تاویل بتاتا ہوں مجھے ذرا (قید خانے میں یوسف کے پاس) بھیج دیجیے۔ یوسف! اے راست باز! مجھے اس خواب کی تعبیر بتا کہ سات موٹی گائیں ہیں الخ)

بائبل اور تلمود سے اس کی تفصیل یوں معلوم ہوتی ہے اور قیاس و قرینہ بھی یہی کہتا ہے کہ شاہی ساقی نے یوسف کے حالات بادشاہ اور اس کے درباریوں سے بیان کیا اور انھیں اپنے خواب کا قصہ اور اس کی تعبیر یاد دلائی جو حضرت یوسف نے انہیں بتائی تھی اور جو بالکل صحیح نکلی تھی۔ اس نے فوراً آگے بڑھ کر عرض کیا کہ اس خواب کی تعبیر میں آپ لوگوں کو بتاؤں گا۔ بشرطیکہ مجھے قید خانے میں ان سے ملنے کی اجازت دیں۔ درباریوں نے اجازت دے دی وہ جیل خانے میں حاضر ہو گیا اور جاتے ہی اَیُّہَا الصِّدِّیق سے خطاب کیا۔ اتنی ساری باتیں قرینہ کی موجودگی کی وجہ سے حذف کر دی گئی ہیں۔

سورہ یٰسٓ میں اس اسلوب کی کار فرمائی دیکھیے:

جب مرد مومن نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی تو فرمایا:

وَمَا لِیَ لاَ أَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِی وَ إِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ءَ أَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖ آلِهَةً إِنْ یُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لاَ تُغْنِ عَنِّیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْئًا وَّ لاَ یُنْقِذُوْنِ إِنِّیْ إِذًا لَّفِیْ ضَلاَلٍ مُّبِیْنٍ إِنِّیْ آمَنْتُ بِرَبِّکُمْ فَاسْمَعُوْنِ (یٰسین: ۲۲-۲۵)
(اور میں کیوں نہ بندگی کروں اس ذات کی جس نے مجھ کو پیدا کیا اور اسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے! کیا میں اس کے سوا دوسروں کو معبود بناؤں اگر خدائے رحمان مجھے کوئی تکلیف پہونچانی چاہے تو نہ ان کی سفارش میرے کچھ کام آئے گی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکیں گے بے شک میں اس وقت ایک کھلی ہوئی گمرہی میں ہوں گا۔ میں تمہارے رب پر ایمان لایا تو میری بات سن لو۔)

اس کے فوراً بعد کہا گیا:

قِیْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ (یٰسین: ۲۶) (ارشاد ہوا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ)

Marfat.com

یہاں قرینے سے معلوم ہو رہا ہے کہ قوم نے مرد مومن کی دعوت رد کر دی اور اسے شہید کر دیا۔ شہادت نصیب ہوتے ہی اس شخص کو جنت کی بشارت دے دی گئی۔ جونہی وہ موت کے دروازے سے گذر کر دوسرے عالم میں داخل ہوا فرشتے اس کے استقبال کو موجود تھے۔ انھوں نے اسے خوش خبری دی کہ فردوس بریں تمہارا منتظر ہے۔ قرآن نے ان تفصیلات کو حذف کر دیا کیوں کہ اطناب کلام کا عیب ہے اور قرینہ سے یہ باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔

Marfat.com

۱۱- استفہام

کسی نامعلوم چیز کے بارے میں سوال کرنا استفہام کہلاتا ہے۔ مثبت اور منفی دونوں طریقوں سے سوال کیا جاتا ہے۔ مثبت سوال کے لیے قرآن کی یہ آیت پڑھیے:

أَيَحْسَبُ الإِنْسَانُ أَنْ لَّنْ نَجْمَعَ عِظَامَهٗ (قیامہ: ۳)

(کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کر سکیں گے)

لیکن قرآن کی مندرجہ ذیل آیت منفی انداز میں سوال کی مثال پیش کرتی ہے:

أَلا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الخبيرُ (ملك: ۱۴)

(کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے! وہ تو بڑا ہی باریک بیں اور خبر رکھنے والا ہے)

استفہام اپنے عام مفہوم سے ہٹ کر دوسرے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور سوال کرنے کے علاوہ اس کے دیگر فوائد بھی ہیں جن میں سے چند یہاں درج کیے جاتے ہیں:

۱- تاکید- بسا اوقات استفہام کے ذریعہ سوال کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ محض تاکید کے لیے یہ اسلوب استعمال ہو جاتا ہے کلام عرب میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ ابو طیب متنبّی کہتا ہے:

مَنْ للمحافل والجحافل والسُّرىٰ فقدت بِفقدك نيّر لا يطلع
و من اتخذت على الضيوف خليفة ضاعوا و مثلك لايكاد يضيّع(۱۱۹)

(اب ان محفلوں، لشکروں کے لیے اور دشمنوں کے استیصال کے لیے کون بچا ہے؟ آپ کے فوت ہونے سے آفتاب غروب ہو گیا۔ جواب طلوع نہ ہوگا۔ آپ نے مہمانوں پر کس کو نائب بنایا ہے۔ کہ وہ برباد ہو گئے ہیں۔ آپ جیسا آدمی کبھی برباد نہیں کرتا تھا)

یہاں دیکھیے استفہام سوال کرنے کے لیے نہیں آیا ہے۔ بلکہ مرثی کی عظمت و بلندی کو اجاگر کرنے اور اپنی بات کو موکد بنانے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ شاعر کا مندرجہ ذیل شعر دیکھیے۔ وہ اپنی محبوبہ کے حسن و جمال کا استفہامیہ انداز میں کس طرح تذکرہ کرتا ہے:

و عقار عيش لن يعاقرها عيش انيقٌ
هى للزهو نظامٌ و الى اللهو طريقٌ

Marfat.com

قلت لمّا لاحَ لی فیها شعاعٌ و بریق
أ شفیقٌ أم عتیـق أم رحیق أم حریقٌ

(اس کے پاس زندگی کے ساز و سامان ایسے ہیں کہ جو کسی بہترین زندگی گزارنے والے کو بھی میسر نہیں! وہ نشو وارتقاء کی پابند ہے اور لہو و لعب کی گذرگاہ!
جب مجھے اس کے اندر کہن اور کوند نظر آئی تو میں نے کہا
یہ سراپا محبت و شفقت ہے یا آزاد خاتون ہے؟ شراب کہنہ ہے یا شعلۂ سوزاں؟)

قرآن پاک میں استفہام کا یہ اسلوب تاکید و تعظیم کے معنی میں بہت استعمال ہوا ہے سورہ قیامہ کی مندرجہ ذیل آیات میں استفہام کا زور دیکھیے:

أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِنْ مَّنِيٍّ يُمْنٰى ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى فَجَعَلَ مِنْه الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى أَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلٰى أَن يُحْيِيَ الْمَوْتٰى (قیامہ:۳۷-۴۰)

(کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے پھر وہ ایک لوتھڑا بنا پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضاء درست کیے پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ مرنے والوں کو پھر سے زندہ کر دے؟)

۲- کبھی کبھی استفہام اقرار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، مقصد غور و تدبر کے بعد مخاطب کو اقرار و اعتراف پر آمادہ کرنا ہوتا ہے۔ ابن الرومی اپنے ممدوح عبید اللہ بن عبداللہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

أَلَستَ المـرءَ لاعـزمٌ كهـامٌ ولا بخلٌ اليـه بـذر انتساب
ألست المـرء يجبى كل حمـد إذا ما لم يكن للحمد جاب (۱۲۰)

(کیا آپ وہ شخص نہیں ہیں جس کا عزم کبھی پست نہیں ہوتا۔ اور جس کی طرف بخل کی نسبت کبھی نہیں کی جاسکتی؟
کیا آپ وہ مردِ میدان نہیں ہیں جو تمام تعریفوں کو سمیٹ لیتا ہے۔ جب کہ تعریف کو سمیٹنے والا کوئی نہیں ہوتا؟)

اس ممدوح کی تعریف دوسرے شعر میں یوں کرتا ہے:

Marfat.com

ألستَ مبشِّری فی کل یومٍ بوشكِ ترمُّل إثرَ الشباب (۱۲۱)

(جوانی ختم ہونے کے بعد جب کہ موت قریب آچکی ہے کیا آپ مجھے روزانہ حیات کی بشارت نہیں سناتے ہیں؟)

بحتری خلیفہ متوکل علی اللہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

ألستَ أعمَّهُم جودًا و أزکا هُم عوداً و امضاهم حساماً (۱۲۲)

(کیا آپ تمام خلفاء میں سب سے زیادہ سخی، سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ رعب ودبدبہ والے نہیں ہیں؟)

یہاں تمام اشعار میں ابن رومی اور بحتری اپنے ممدوحین سے کچھ پوچھنا نہیں چاہتے ہیں بلکہ ان سے ان کی خوبیوں کا اعتراف کرانا چاہتے ہیں۔

قرآن پاک نے اس اسلوب کو بڑے عمدہ طریقے سے استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

أفتُؤمِنُونَ ببعض الکِتَابِ و تکفُرونَ بِبَعضٍ فَمَا جزاءُ من یَفعَلُ ذٰلِكَ مِنکُم اِلاّ خِزیٌ فِی الحیٰوةِ الدُّنیَا۔(۸۵)

(کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو۔ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار ہو کر رہیں)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل سے ان کا یہ جرم باور کرانا چاہتا ہے کہ تمہاری ازل سے یہ روش رہی ہے کہ کتاب کے اُس حصے پر ایمان لاتے ہو جو تمہاری خواہشات کے مطابق ہوتی ہیں اور جو تمہاری ہوائے نفس کی تکمیل میں رکاوٹ بنتی ہیں ان کا انکار کر دیتے ہو کیا تمہارا یہ رویہ نہیں رہا ہے؟

سورہ فیل میں ہے:

أَلَم یَجعَلُ کَیدَهُم فِی تَضلِیلٍ وّ أرسَلَ عَلَیهِم طَیرًا أبَابِیلَ (فیل: ۲-۳)

(کیا ان کی چال بالکل برباد نہ کر دی اور ان پر جھنڈ کی جھنڈ چڑیاں نہ بھیجیں؟)

یہاں سوال کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ مخاطب کو یہ باور کرانا مقصود ہے کہ ایسا ہو چکا ہے۔ سورہ صافات میں حضرت ابراہیمؑ سے جب کسر اصنام کے متعلق پوچھا جاتا ہے تو وہ اپنی قوم سے یوں سوال کرتے ہیں۔

Marfat.com

أَتَعبُدُونَ مَا تَنحِتُونَ وَاللهُ خَلَقَكُمۡ وَ مَا تَعمَلُونَ۔ (۹۵-۹۶)

(کیا تم لوگ اپنے ہی ہاتھوں کی گھڑی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو! اللہ ہی نے پیدا کیا ہے تم کو بھی اور ان چیزوں کو بھی جن کو تم بناتے ہو)

یہاں سوال کرنا مقصود نہ تھا کیوں کہ حضرت ابراہیمؑ کو ان بتوں کی حقیقت معلوم تھی۔ مقصد اس امر کا اعتراف کرانا تھا کہ یہ تمہاری عقل باختگی اور شامت زدگی ہے کہ اپنے ہی ہاتھوں کی گھڑی ہوئی لکڑی اور پتھر کی مورتوں کی پوجا کرتے ہو۔

۴۔ تعجب: کبھی کبھی استفہام کا استعمال تعجب کے لیے بھی ہوتا ہے مثال کے طور پر ابو طیب متنبّی کو بخار آ گیا تو اس نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

أبنت الدهر عندی کلّ بنت فکیف وصلت انت من الزحام (۱۲۳)

(میرے پاس زمانے کی تمام مصیبتیں جمع ہیں اے زمانے کی بیٹی (بخار مراد ہے) آخر تو اس اژدہام سے کیسے نکل آئی؟)

ابو تمام اپنی حیرانی کا اظہار یوں کرتا ہے:

ما للخطوب طفت علیّ کأنّها جَهِلت بانّ نداك بالمرصادِ (۱۲۴)

(حوادث زمانہ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ میرے اوپر حملہ آور ہو گئے ہیں۔ گویا انہیں نہیں معلوم کہ تیری بخشش انتظار میں ہے؟)

سورہ قیامہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أيحسب الإنسَانُ أن لن نجمع عِظَامَهٗ (۳)

(کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟)

یہاں اللہ تعالیٰ استعجاب اور حیرت کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ انسان آفاق و انفس کی تمام نشانیوں کو اور اپنی خلقت و ممات کو دیکھتے ہوئے بعث بعد الموت کے بارے میں شک میں پڑا ہوا ہے؟ کیا اسے یہ پوری کائنات نظر نہیں آتی ہے؟ کیا وہ ان کی تخلیق پر غور نہیں کرتا؟

اسی سورہ میں پھر حیرت کے ساتھ کہتا ہے:

أَيَحۡسَبُ الإنسَانُ أن يُّترك سُدیٰ (قیامه : ۳۶)

(کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟)

Marfat.com

یعنی جو لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے پر تعجب کر رہے ہیں کیا وہ یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ انسان غیر مسئول چھوڑ دیا جائے گا؟ جب کائنات کی ہر چیز ایک مقصد کے تحت پیدا کی گئی ہے اور ہر ایک نظام فطرت کے ساتھ منسلک ہو کر مصروف عمل ہے تو کیا خاکی انسان اس بھری پُری دنیا میں بے کار محض بنایا گیا ہے اور کیا قیامت کے دن اس سے باز پُرس نہ ہوگی؟

۴- انکار: بسا اوقات اظہار انکار کے لیے استفہام کو استعمال کیا جاتا ہے۔ متنبّی اپنے ممدوح کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے:

أتلتمس الأعداء بعد الذی رأت قیام دلیل أو وضوح بیان (۱۲۵)

(کیا دشمن میرے ممدوح کی تمام عظمتوں کو دیکھنے کے بعد بھی کسی دلیل یا وضاحت کی تلاش میں ہیں؟)

یعنی دشمن جب کہ ہر سخت مرحلہ میں اور ہر نازک موقع پر ممدوح کی کامیابی اور بلند ہمتی دیکھ چکے ہیں اب انہیں اس کی عظمت و بلندی کے لیے کوئی اور دلیل تلاش کرنے کی زحمت نہیں کرنی چاہیے۔

بحتری کہتا ہے:

أ أکفرك النعماء عندی وقد نمت علیّ نمو الفجر والفجر ساطع

و أنت الّذی أعززتنی بعد ذلّتی فلا القول مخفوض ولا الطرفّ خاشع(۱۲۶)

(کیا میں تیرے احسانات کا انکار کر سکتا ہوں جو میرے اوپر روشن فجر کی طرح بڑھتے پھیلتے رہے ہیں؟ آپ ہی کی ذات ہے جس نے مجھے عزت و شوکت بخشی جب کہ میں ذلیل ہو چکا تھا لیکن اب باتوں میں پستی ہے نہ نگاہوں میں ذلت ہے)

یہاں شاعر اپنے ممدوح سے سوال نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس امر کا اظہار کرنا چاہتا ہے کہ تیرے احسانات کے بوجھوں تلے دبا ہوا ہوں۔ تیری عنایات ہی نے مجھے ذلت کے گڑھے سے نکال کر عزت و شہرت کے قصر رفیع تک پہنچایا ہے، تو کیا میں تیرے ان احسانات کو فراموش کر سکتا ہوں؟ ہرگز نہیں یہ مجھ سے کبھی نہیں ہو سکتا۔

قرآن کہتا ہے:

أَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ مَا لَكُمْ كَيف تَحْكُمُوْنَ (صافات: ۱۵۳-۱۵۴)

(کیا اس نے بیٹوں پر بیٹیوں کو ترجیح دی؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟)

Marfat.com

یہاں قرآن نے انتخاب و ترجیح کا سرے سے انکار کیا ہے یعنی اللہ نے اس طرح کا کوئی انتخاب نہیں کیا ہے اور نہ اس کے یہ شایان شان ہے تم نے اپنے جی سے فرشتوں کو اس کی بیٹیاں قرار دیا ہے۔

سورہ مریم میں ہے:

أَطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (مریم : ۷۸)

(کیا اس نے غیب میں جھانک کر دیکھ لیا ہے یا خدائے رحمٰن سے کوئی عہد کرا لیا ہے)

یہاں اللہ نے ان چیزوں کی تردید فرمائی ہے کہ نہ انھوں نے غیب کے پردوں میں جھانک کر ان تمام چیزوں کو دیکھا ہے جو ان کو آخرت میں ملنے والی ہیں نہ خدا سے انھوں نے گارنٹی لکھوائی ہے پھر آخر انہیں کس بوتے پر ناز ہے؟

قرآن پاک میں اس اسلوب کی مثالیں بہت ہیں۔

۵- امر: بسا اوقات استفہام امر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے قرآن پاک اس اسلوب کے استعمال سے بھرا پڑا ہے چند ایک مثالیں یہاں نقل کی جاتی ہیں:

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ (مائدہ: ۹۱)

(شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ تمہارے اندر شراب اور جوئے کے ذریعہ بغض و عداوت ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد اور نماز سے روک دے پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟)

یہاں هَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ دراصل إِنْتَهُوا عَنْهَا کے معنی میں مستعمل ہے یعنی شراب اور جوئے جو دنیوی نقصانات ہیں ان سے قطع نظر یہ چیزیں اللہ کی یاد اور نماز سے غافل کر دینے والی ہیں اس لیے تم ان سے باز آجاؤ۔

سورہ ہود میں فرمایا:

فَإِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَأَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ (ہود : ۱۴)

(اب اگر وہ تمہاری مدد کو نہیں پہنچتے تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں پھر کیا تم سر تسلیم خم کرتے ہو؟)

Marfat.com

یہاں فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ استفہام کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ امر کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے، یعنی أَسْلِمُوْا لِهَذا الكتاب وَآمِنُوْا به (اس کتاب پر ایمان لے آؤ اور اسے صدق دل سے تسلیم کرلو)

سورہ فرقان میں ہے:

وَ جَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً أَتَصْبِرُوْنَ وَ كَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا (فرقان:۲۰)

(ہم نے تم لوگوں کو ایک دوسرے کے لیے آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے کیا تم صبر کرتے ہو تمہارا رب سب کچھ دیکھتا ہے)

یعنی اے مسلمانو اگر تمہارے مخالفین اپنے امتحان میں ناکام رہے تو ان کو ان کی قسمت کے حوالے کردو اور تمہارے سامنے صبر کا جو مرحلہ ہے اس میں کامیابی کے لیے عزم و حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھو اللہ تمہارا نگراں ہے اگر تم ثابت قدم رہے تو وہ تمہیں ان مخالفتوں کے علی الرغم منزل مقصود تک پہنچائے گا۔ یہاں أتصْبِرُوْنَ دراصل إصْبِرُوا کے مفہوم میں ہے۔

سورہ صافات میں ہے:

وَ إذا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا و عِظَامًا ءَإِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ قَالَ هَلْ أَنْتُمْ مُطَّلِعُوْنَ فَاطَّلَعَ فَرَأَهُ فِيْ سَوَآءِ الجَحِيْمِ (۵۳-۵۵)

(کیا واقعی جب ہم مرچکے ہوں گے اور مٹی وہڈی ہوجائیں گے تو ہمیں جزا و سزا دی جائے گی؟ کہے گا ذرا جھانک کے دیکھو تو سہی! تو وہ جھانکے گا اور اس کو جہنم کے بالکل بیچ میں دیکھے گا)

یہاں فَهَلْ أَنْتُمْ مُطَّلِعُوْنَ دراصل إطَّلِعُوا فِيْهَا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

سورہ شعراء میں ہے:

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَعْلُوْمٍ وَ قِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنْتُمْ مُجْتَمِعُوْنَ (شعراء:۳۸-۳۹)

(ایک روز مقرر وقت پر جادوگر اکٹھا کرلیے گئے اور لوگوں سے کہا گیا کہ جمع ہو جاؤ)

یہاں فَهَلْ أَنْتُمْ مُجْتَمِعُوْنَ میں انداز تو استفہام کا ہے لیکن مفہوم امر کا ہے یعنی إجْتَمِعُوا.

اسالیب عرب سے واقفیت رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ جب امر کے اندر ترغیب و تشویق اور تحریص کا مفہوم پیدا کرنا ہو تو وہ انشائیہ اسلوب کے قالب میں آنے کے بجائے خبریہ اسلوب کے قالب میں آتا ہے اور اس پر حرف استفہام کا ورود اس میں مزید زور پیدا کردیتا ہے۔

Marfat.com

اس اسلوب میں امر کی جگہ استفہام کو استعمال کرنے میں یہی حکمت اور بلاغت کار فرما ہے۔

۶- تحقیر: بسا اوقات استفہام کا یہ اسلوب تحقیر کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

متنبّی کافور کی ہجو میں لکھتا ہے:

مِنْ أيَّةِ الطُّرق یاتی مثلك الكرمُ　　أيْنَ المحاجمُ یا كافورُ و الجلمُ (۱۲۷)

(کن راستوں سے تمہارے پاس شرافت آسکتی ہے؟ اے کافور سینگی اور استرا کہاں چھوڑ کے آئے ہو؟)

یہاں سوال کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ شاعر کافور کا مذاق اڑا رہا ہے اور اس کی تنقیص کر رہا ہے۔ ابو العلاء معرّی کہتا ہے:

أتظُنُّ أنّكَ للمعالی كاسب　　و خبیُ أمرِكَ شِرّةٌ و شِنَارُ (۱۲۸)

(کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم بلند کارناموں کے حصول کے لیے پیدا ہوئے ہو اور تمہیں بلند مراتب مل جائیں گے۔ جب کہ حرص و حسد جیسی بدترین برائیاں تمہارے اندر پوشیدہ ہیں؟)

ایک دوسرا شاعر دشمن کی دھمکیوں کا مذاق یوں اڑاتا ہے:

فَدَع الْوَعِیْدَ فَمَا وَعِیْدُكَ ضائری　　أطنین أجُنحـة الـذباب یضیرُ (۱۲۹)

(یہ گیدڑ بھبکی چھوڑ دو کہ اس سے میرا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے۔ کیا مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے؟)

سورۂ صافات میں فرمایا:

أتَدْعُون بعلاً و تَذَرُونَ أحسنَ الْخَالِقِيْنَ (صافات: ۱۲۵)

(کیا تم لوگ بعل کو پکارتے ہو اور بہترین خالق کو چھوڑتے ہو)

یہاں حضرت الیاسؑ نے اپنی قوم پر پھبتی کسی ہے کہ تم لوگ کس قدر نامعقول ہو کہ بہترین خالق اللہ کو چھوڑ کر جو تمہارا اور تمہارے تمام اگلوں کا رب ہے، بعل دیوتا کی پرستش کرتے ہو جو ایک بے جان پتھر ہے!

اسی سورہ میں حضرت ابراہیم کا قول یوں نقل کیا گیا ہے:

مَا ذَا تَعْبُدُوْنَ أئِفكاً آلِهَةً مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ تُرِیْدُوْنَ فَمَا ظَنُّكُم بِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ (صافات: ۸۵-۸۷)

(یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو؟ کیا اللہ کو چھوڑ کر دوسرے من گھڑت معبودوں کے طالب ہو؟ تو خداوند عالم کے باب میں تمہارا کیا گمان ہے!)

Marfat.com

ظاہر ہے یہاں سوال کرنے کا مقصد بتوں کا مذاق اڑانا اور ان کی تحقیر کرنا ہے۔ آگے حضرت ابراہیمؑ بتوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

أَلا تَأْكُلُونَ مَا لَكُمْ لاَ تَنْطِقُونَ (۹۱-۹۲)

(آپ لوگ نوش نہیں فرماتے! کیا بات ہے کچھ بولتے نہیں!)

یہاں حضرت ابراہیم بتوں پر طنزیہ فقرے چست کر رہے ہیں کہ یہ لذیذ کھانے اور حلوے مانڈے جو آپ کے پجاریوں نے آپ کے سامنے پیش کیے ہیں ان کو آخر تناول کیوں نہیں فرماتے! اور یہ آپ لوگ چپ چپ سے کیوں ہیں! کچھ گفتگو کیوں نہیں کرتے؟

سورۂ انعام میں ہے:

قُلْ أَغَيْرَ اللّٰهِ أَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ وَ هُوَ يُطْعِمُ وَ لاَ يُطْعَمُ (۱۴)

(کہو کیا میں اللہ کے سوا، جو آسمانوں اور زمینوں کا خالق ہے، کسی اور کو اپنا کارساز بناؤں اور وہ کھلاتا ہے کھاتا نہیں)

یہاں سوال کرنا مقصد نہیں ہے بلکہ غیر اللہ معبودوں کی بے وقعتی ظاہر کرنا اور ان پر تعریض کرنا مقصود ہے۔ فرمایا کہ مولیٰ و مرجع بنائے جانے کا سزاوار تو وہ ہے جس کے فضل و کرم سے سب کو روزی مل رہی ہے نہ کہ تمہارے وہ اصنام خیالی جن کے سلسلے میں تمہیں خود یہ تسلیم ہے کہ ان کے آگے حلوے مانڈے تم پیش کرتے ہو تب وہ راضی و آسودہ ہوتے ہیں۔

سورۂ شعراء میں ہے:

قَالَ فِرْعَوْنُ وَ مَا رَبُّ الْعَالَمِيْنَ قَالَ رَبُّ السَّمٰوات وَالأَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا إِنْ كُنْتُمْ مُوقِنِيْنَ (شعراء : ۲۳-۲۴)

(فرعون نے پوچھا اور یہ رب العالمین کیا چیز ہے؟ اس نے جواب دیا کہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کا خداوند، اگر تم لوگ یقین کرنے والے بنو!)

اوپر حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی طویل گفتگو نقل ہوئی ہے جس میں حضرت موسیٰؑ نے اس کو توحید کی دعوت دی تھی اور اس کے طعنے اور اظہار احسان کا مسکت جواب دے دیا تھا اب اس کے لیے کچھ مزید کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی اس وجہ سے اس نے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے حضرت موسیٰؑ کے دعوائے رسالت کا مذاق اڑانے کی کوشش کی اور بانداز تحقیر سوال کیا کہ یہ رب العالمین کیا چیز ہے جس کے تم رسول بن کر آئے ہو؟ اس کا مطلب یہ تھا کہ سب سے بڑے دیوتا کا اوتار اور

Marfat.com

رب العالمین تو میں ہوں، تو میرے ہوتے اور کون رب العالمین ہے، جس نے تم کو رسول بنا کر بھیجا؟ سورۂ ہود میں حضرت شعیبؑ جب اپنی قوم کو توحید اور بندگی کی دعوت دیتے ہیں تو قوم ان کا مذاق یوں اڑاتی ہے:

یٰشُعَیبُ أَصَلٰوتُكَ تَأمُرُكَ أَنْ نَتْرُكَ مَا یَعْبُدُ آبَاءُ نَا وَ أَنْ نَفْعَلَ فِیْ أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ (ھود:۸۷)

(اے شعیب کیا تمہاری نماز تمہیں یہ سکھلاتی ہے کہ ہم ان چیزوں کو چھوڑ بیٹھیں جن کی ہمارے باپ دادا پرستش کرتے آئے یا یہ کہ ہم اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کریں؟ بس تمہیں تو ایک دانشمند اور راست رو رہ گئے ہو!)

یہاں دیکھیے اسلوب استفہام کا ہے لیکن پورا فقرہ طنز و تضحیک سے پر ہے۔ قوم کے لوگوں نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ کیا تمہاری نماز تمہیں یہی سکھاتی ہے کہ جن معبودوں کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے۔ ہم ان کی عبادت ترک کر دیں اور اپنے مال میں اپنی صوابدید کے مطابق تصرف نہ کریں۔ تمہاری ان باتوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری نگاہ میں سب اگلے پچھلے بے وقوف اور گمراہ تھے بس تمہی ایک دانا و بینا اور راہ یاب رہ گئے ہو۔

۷- توبیخ: بسا اوقات استفہام کے اسلوب میں لعنت و ملامت اور زجر و توبیخ کا فائدہ بھی حاصل کیا جاتا ہے۔ ایک شاعر مخاطب افراد کو ملامت یوں کرتا ہے:

إلامَ الخُلفُ بینکم إلامَا و ھٰذی الضجّۃُ الکبریٰ عَلامَا؟ (۱۳۰)

(تم لوگوں میں یہ وعدہ خلافی کب تک جاری رہے گی اور یہ نالہ و شیون کس بات پر ہے)

یہاں شاعر نے مخاطب کو وعدہ خلافی اور چیخ و پکار مچانے پر ملامت کی ہے۔ ابوالطیب متنبّی کہتا ہے:

حتّٰی متٰی أنتَ فی لھو وّ فی لعب وَالْمَوت نحوك یھوی فاتحاً فاہٗ (۱۳۱)

(کب تک تم لہو و لعب میں مست رہو گے جب کہ موت منہ کھولے تمہاری طرف بڑھ رہی ہے)

سورہ شعراء میں فرعون نے حضرت موسیٰؑ کا استخفاف کیا جب انھوں نے انذار کے ساتھ ساتھ اس کے سامنے بنی اسرائیل کو ساتھ لے جانے کا مطالبہ بھی رکھا۔ اس نے زجر و ملامت کے انداز میں کہا:

أَلَمْ نُرَبِّكَ فِیْنَا وَلِیْدًا وَ لَبِثْتَ فِیْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِیْنَ (شعراء: ۱۸)

(کیا ہم نے تم کو بچپن میں اپنے اندر پالا نہیں؟ اور تم نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے اندر بسر کیے؟)

Marfat.com

دراصل فرعون یہ تصور نہ کر سکتا تھا کہ کوئی اس کے سامنے اتنا بڑا دعویٰ اور اتنا اہم مطالبہ لے کر آئے گا اور وہ بھی ایک اسرائیلی! چناں چہ اس نے نفرت و توبیخ اور زجر و ملامت کے انداز میں کہا کہ کیا تم وہی نہیں ہو جس کی پرورش بچپن میں ہم نے اپنے گھر میں کی ہے۔ یعنی ایاز قدر خود را بشناس! تم ہمارے پروردہ ہونے کے باوجود ہمارے سامنے اپنی نبوت کا دعوی کر رہے ہو اور بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ لے کر اٹھے ہو! اب میری بلی مجھی کو میاؤں میاؤں کہے گی؟

سورہ یونس میں ہے:

أَتَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ مَا لاَ تَعْلَمُونَ (٦٨)

(کیا تم اللہ کے متعلق وہ باتیں کہتے ہو جو تمہارے علم میں نہیں ہیں)

یہاں اللہ تعالیٰ منکرین حق کو ڈانٹ رہا ہے کہ کیا تمہیں اللہ کے خلاف بے بنیاد باتیں کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ تم خدا کے عذاب سے بالکل ہی بے پرواہو گئے ہو؟

سورۂ القارعہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

أَلْقَارِعَةُ مَاالْقَارِعَةُ وَ مَا أَدْرَاكَ مَاالْقَارِعَةُ (۱-۳)

(کھٹکھٹانے والی، کیا ہے کھٹکھٹانے والی! اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے کھٹکھٹانے والی!)

اس اسلوب میں عوام کی غفلت و نااندیشی پر سرزنش اور توبیخ ہے۔ یہاں سوال کی نوعیت ایک الارم کی ہے تاکہ جو لوگ اس کو معمولی بات سمجھ کر اس سے بے پرواہیں وہ چوکنے ہو جائیں اور کان کھول کر اس کا حال سن لیں۔

۸- نفی: کبھی کبھی استفہام اپنے عام معنی سے نکل کر مجرد نفی کا معنی بھی دیتا ہے۔

ابن رومی اپنے ایک قصیدے میں ابن بلبل کی مدح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

أ أعرفهٗ و لست له نسيبًا و تجهله و انت له نسيب

(کیا میں اس سے واقف رہوں جب کہ میرا اس سے کوئی نسبی رشتہ نہیں ہے اور آپ اس سے ناواقف ہیں جب کہ آپ کا وہ رشتہ دار ہے۔)

یہاں أ أعْرفهٗ دراصل لاَ أعرفه کے معنی میں مستعمل ہے۔ بحتری کہتا ہے:

هل الدهر إلا غمرة و انجلاء ها و شيكا و إلا ضيقة و انفراجُها (۱۳۲)

(زمانہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ایک سختی آئے اور فوراً ختم ہو جائے، تنگی ہو اور فوراً اس کے دہانے کھل جائیں)

Marfat.com

یہاں هل الدهر دراصل مَا الدّهر کے معنی میں ہے۔ابو تمام کہتا ہے:

هل اجتمعت أحياء و معد و مذحج بملتحم إلاّ و أنت أميرها (۱۳۳)

(معد اور مذحج کے قبائل میدان جنگ میں جمع نہیں ہوئے مگر آپ ان کی قیادت کر رہے تھے)

یہاں هل اجتمعت دراصل مَا اجتمعت کے مفہوم میں ہے۔

قرآن مجید نے اس اسلوب کو بہت استعمال کیا ہے۔ سورہ دہر میں ہے:

هَلْ أتٰى عَلَى الإنسانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا (۱)

(کیا گذرا ہے انسان پر کوئی وقت زمانے میں، جب کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا)

یہاں هَلْ نفی کے معنی میں ہے۔

سورہ یونس میں فرمایا:

ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ إلاَّ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ (یونس: ۵۲)

(پھر ظالموں سے کہا جائے گا اب ہمیشہ کے عذاب کا مزہ چکھو۔ جو کچھ کماتے رہے ہو اس کے پاداش میں اس کے سوا اور کوئی بدلہ نہیں دیا جا سکتا)

یہی اسلوب یہاں بھی کار فرما ہے هَلْ نفی کے معنی میں ہے۔

سورۂ فاطر میں ہے:

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ إلاَّ سُنَّةَ الأوَّلِيْنَ (فاطر: ۴۳)

(پس یہ نہیں انتظار کر رہے ہیں مگر اسی سنت الٰہی کا جو اگلوں کے باب میں ظاہر ہوئی)

سورہ نحل میں ہے:

هَلْ يَنْتَظِرُوْنَ إلاَّ أنْ تَاتِيَهُمُ الْمَلاَئِكَةُ أوْ يَاتِيَ أمْرُ رَبِّكَ (نحل: ۳۳)

(یہ لوگ نہیں منتظر ہیں مگر اس بات کے کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تیرے رب کا حکم ہی آجائے)

یہاں هل نہی کے معنی میں ہے۔ یعنی یہ متکبرین رسالت کی تصدیق کے لیے اس وقت تک تیار نہیں جب تک انکے پاس فرشتے نہ آئیں یا ان پر وہ عذاب ہی نہ آجائے جس کی ان کو خبر دی جا رہی ہے۔

Marfat.com

۱۲- نفی

کلام عرب میں نفی کا استعمال عام طور پر کسی شئ کے عدم کے اثبات کے لیے ہوتا ہے لیکن اس کے استعمال کی کئی شکلیں ممکن ہیں۔ جن میں سے چند ایک پر یہاں روشنی ڈالی جاتی ہے:

ا۔ نفی الملزوم بلازمہ :- یعنی بظاہر ایک شی کی نفی ہوتی ہے لیکن مقصود دراصل ملزوم کی نفی ہوتی ہے۔ کلام پاک اور کلام عرب میں اس اسلوب کی مثالیں بہت ہیں۔ امرؤالقیس اپنے ایک قصیدے میں ایک صحرائی راستے کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

عَلی لاحب لا یهتدی بمناره إذا سَافَه العود النباطیّ جرجرا (۱۳۴)

(واضح راستے پر، جس کی برجیوں سے راستہ معلوم نہیں کیا جاتا، جب موٹا تازہ اونٹ اسے سونگھتا ہے تو بلبلا اٹھتا ہے)

یہاں شاعر کا مقصود یہ نہیں ہے کہ راستے میں برجیاں تو ہیں لیکن ان سے راستہ نہیں معلوم ہوتا ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس صحرا میں رہنمائی کے لیے برجیاں اور منارے ہیں ہی نہیں۔

ایک دوسرا شاعر کہتا ہے:

لیس بها ضبّ فینحجرٌ (اس میں کوئی گوہ نہیں ہے جو رینگے)

یعنی وہاں سرے سے کوئی گوہ ہی نہیں ہے۔ ایک عرب عورت کہتی ہے:

ألا فاقصری مِن دمع عینیك لن تری ابا مثله تنمی الیه المفاخرٌ (۱۳۵)

(خاموش ہو جاؤ، اپنی آنکھوں کے آنسوؤں کو روک لو، تم اس جیسا کوئی باپ نہ پاسکو گی جس پر قابل فخر کارنامے ختم ہو چکے ہیں)

یعنی مرثی جیسا کوئی باپ موجود ہی نہیں ہے کہ تم اسے دیکھ سکو۔

ایک تیسرا شعر ہے:

تردین جلباب الحیاء فلم یرئ لذیولهن علی الطریق غبارٌ

(وہ حیاء کی چادر اوڑھتی ہیں۔ راستے میں ان کے دامن پر غبار نظر نہیں آتا)

Marfat.com

یہاں شاعر کی مراد یہ ہے کہ یہ شریف زادیاں گھر سے باہر قدم ہی نہیں نکالتی ہیں کہ ان کے دامن پر گرد و غبار نظر آنے کی نوبت پہنچے۔

قرآن کہتا ہے:

لاَ یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ لاَ یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لاَ هُمْ یُنْصَرُوْنَ (بقرہ:۴۸)

(نہ کسی کی طرف سے شفاعت قبول ہو گی اور نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی)

یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اس دن نہ کوئی شفاعت کرنے والا ہو گا، نہ کوئی شفاعت قبول ہو گی، نہ کسی کے پاس دینے کے لیے معاوضہ ہو گا، نہ کسی سے معاوضہ لیا جائے گا، نہ کسی کی حمایت اور مدد کی جا سکے گی۔

سورہ یونس میں فرمایا:

قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللّٰهَ بِمَا لاَ یَعْلَمُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالأَرْضِ (۱۸)

(اے نبی، ان سے کہو کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جسے نہ وہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ زمین میں)

سورہ رعد میں یہی مضمون یوں بیان ہوا ہے:

أَمْ تُنَبِّئُونَهٗ بِمَا لا یعلم فِی الأَرضِ أَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ (۳۳)

(کیا تم اللہ کو ایک نئی بات کی خبر دے رہے ہو جسے وہ زمین میں نہیں جانتا یا تم لوگ یونہی جو منہ میں آتا ہے بس کہہ ڈالتے ہو)

یہاں مقصود یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں سرے سے کوئی چیز ایسی ہے ہی نہیں جسے اللہ نہ جانتا ہو جو کچھ بھی موجود ہے وہ اللہ کے علم میں ہے۔

سورہ نور میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

رِجَالٌ لاَ تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لاَ بَیْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ إِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ إِیْتَاءِ الزَّكٰوةِ (۳۷)

(یہ ایسے لوگ ہیں جنھیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامت نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی)

Marfat.com

بعض مفسرین اس عدم غفلت کی ایک وجہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ لوگ ہر دم ذکر الٰہی میں مشغول رہتے ہیں اور بیع و شراء میں لگتے ہی نہیں کہ ذکر الٰہی سے غفلت کا مرحلہ آئے۔(۱۳۶)

۲۔ کبھی کبھی ایک فعل کی نفی کر کے اس کے عکس کو ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے اس اسلوب کے مطابق قرآن میں بکثرت لایُحِبّ کو یُبْغِضُ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل آیات کو دیکھیے:

وَاللّٰہُ لاَ یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (حدید: ۲۳)

(اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے اور فخر جتاتے ہیں)

سورہ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاللّٰہُ لاَ یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ أَثِیْمٍ (۲۷۶)

(اور اللہ ناشکروں اور حق تلفوں کو پسند نہیں کرتا)

سورہ اعراف میں فرمایا:

إِنَّہٗ لاَ یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (۵۵)(وہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

ان تمام مقامات پر لاَ یُحِبُّ (وہ محبت نہیں کرتا) دراصل یُبْغِضُ (وہ نفرت کرتا ہے) کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

۳۔ بسا اوقات فعل کی نفی اس کے نتیجہ کے اعتبار سے ہوتی ہے یا دوسرے الفاظ میں ایک فعل کی نفی اس کے کسی خاص مفہوم کے پہلو سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر سورہ انفال میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

وَمَا رَمَیْتَ إِذْ رَمَیْتَ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی (انفال: ۱۷)

(اور اے نبیؐ، جب تو نے پھینکا تو تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا)

غزوۂ بدر میں آنحضرتؐ نے مٹھی بھر کنکریاں لیں اور قریش کی طرف رخ کر کے فرمایا شَاھَتِ الْوُجُوہ (خدایا یہ چہرے بدنما ہو جائیں!) اس کے بعد کنکریاں ان کی طرف پھینک دیں اور صحابہ کرام سے فرمایا، آگے بڑھو۔

اوپر کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مَا رَمَیْتَ میں نتیجہ فعل مراد لیا ہے کیوں کہ یہ ثابت ہے کہ آپؐ نے کنکریاں پھینکی تھیں البتہ اگر اللہ انھیں کار آمد اور دشمنوں کے لیے مہلک نہ بناتا تو آپ

Marfat.com

کا یہ عمل عدم رمی کے برابر تھا۔اسی لیے آگے ولٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی کہہ کر نتیجہ کو خدا کی طرف موڑ دیا ہے۔اس آیت میں نفی واثبات دونوں کے ساتھ ساتھ آنے میں یہی حکمت مضمر ہے۔

مندرجہ بالا آیت سے ذرا قبل ہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ (انفال: ۱۷)

(تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا)

آیت کے اس ٹکڑے میں بھی یہی اسلوب کارفرما ہے۔

۴۔ بسا اوقات مبالغہ کی نفی کی جاتی ہے اور مقصود نفی میں مبالغہ پیدا کرنا ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر امرؤ القیس کہتا ہے:

وَلَيْسَ بِذِيْ سَيْفٍ فَيَقْتُلَنِي بِهٖ وَلَيْسَ بِذِي رُمْحٍ وَ لَيْسَ بِنَبَّالٍ (۱۳۷)

(وہ تلوار بھی نہیں رکھتا کہ اس سے مجھے قتل کردے نہ اس کے پاس نیزہ ہے نہ اسے تیر چلانے کا ڈھنگ آتا ہے)

یہاں لَيْسَ بِنَبَّالٍ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تیر چلانے میں ماہر نہیں ہے بلکہ شاعر کا مقصود یہ ہے کہ اسے تیر چلانے کا فن آتا ہی نہیں ہے۔

ایک دوسری جگہ کہتا ہے:

إذَا الْمَرْءُ لَمْ يَخْزُنْ عَلَيْهِ لِسَانَهٗ فَلَيْسَ عَلٰى شَيْءٍ سِوَاهُ بِخزانٍ (۱۳۸)

(جب آدمی خود اپنے راز کی حفاظت نہ کر سکے تو وہ دوسروں کے رازوں کی کیسے پروا کر سکتا ہے؟)

یہاں بھی لیس بخزّانٍ نفی میں مبالغہ پیدا کرنے کے لیے آیا ہے یعنی جب وہ اپنے راز کی حفاظت نہیں کریگا تو دوسروں کے اسرار کے سلسلے میں اور زیادہ غفلت اور مجرمانہ کوتاہی کا ثبوت دیگا۔

قرآن کہتا ہے:

وَ إِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيْدِ (آل عمران: ۱۸۲)

(اور اللہ اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے)

سورہ قٓ میں یہی مضمون یوں بیان ہوا ہے:

وَ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَ مَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (۲۹)

(میرے یہاں بات پلٹی نہیں جاتی اور میں اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا)

Marfat.com

اسی سورہ میں نبیؐ کو مخاطب کر کے یوں کہا گیا ہے:

نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُوْنَ وَ مَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (قٓ : ۴۵)

(اے نبی جو یہ لوگ باتیں بنا رہے ہیں انہیں ہم خوب جانتے ہیں اور تمہارا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے۔ بس تم اس قرآن کے ذریعہ ہر اس شخص کو نصیحت کر دو جو میری تنبیہ سے ڈرے)

یعنی تم کسی پر زور زبردستی نہ کرو بس انہیں قرآن کی آیات سنا سنا کر یاد دہانی کراؤ۔ تمہارا کام صرف تبلیغ و تذکیر ہے۔ تم ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔

۵۔ کان اور اسم فاعل کے ساتھ حرفِ نفی لا کر استمرار و دوام کے معنی پیدا کرنا مثلاً:

أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِيْنَ (بقرہ: ۱۶)

(یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمرہی خرید لی ہے مگر یہ سودا ان کے لیے نفع بخش نہیں ہے اور یہ ہرگز صحیح راستہ پر نہیں ہیں)

یعنی یہ یہود ہدایت پر ضلالت کو ترجیح دینے کی وجہ سے اور کتمان حق اور حسد و رقابت کی آگ میں جلنے کی وجہ سے کبھی بھی ہدایت نہیں پا سکتے اللہ نے ان کو ہمیشہ کے لیے دھتکار دیا ہے اور ان پر ذلت و مسکنت تھوپ دی ہے۔

سورۂ اعراف میں فرمایا:

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَ مَا كُنَّا غَائِبِيْنَ (اعراف : ۷)

(پھر ہم خود پورے علم کے ساتھ ساری سرگزشت ان کے سامنے پیش کر دیں گے آخر ہم کہیں غائب تو نہیں تھے)

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ازل سے ابد تک کبھی غائب نہیں رہا۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اسی طرح سورہ بقرہ میں فرمایا:

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَ مَاهُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (بقرہ:۸)

Marfat.com

(اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو دعوی کرتے ہیں کہ ہم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں حالاں کہ وہ مومن نہیں ہیں)

ظاہر ہے کہ جو لوگ خدا اور آخرت پر تو ایمان رکھنے کا دعویٰ کریں لیکن رسول کی رسالت کا انکار کریں وہ اپنے ایمان و اخلاص میں سچے کیسے ہو سکتے ہیں اور جب تک یہ ذہنیت باقی رہے گی مستقبل میں ان کی ہدایت کی کسی قسم کی توقع نہیں کی جاسکتی اسی لیے فرمایا وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ.

نفی کے مفہوم میں استمرار و دوام پیدا کرنے کا ایک اسلوب اور ہے وہ یہ کہ نفی حرف كَانَ پر داخل ہو اور كَانَ کی خبر فعل مضارع ہو اور اس پر "ل" داخل ہو۔ جیسے: "مَا كَانَ لِيَفْعَلَ"

قرآن کہتا ہے:

وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ كَذَالِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكَافِرِيْنَ ۔ (اعراف: ۱۰۱)

(ان کے پاس ان کے رسول کھلی نشانیاں لے کر آئے مگر جس چیز کو وہ ایک دفعہ جھٹلا چکے تھے پھر اسے وہ ماننے والے نہ تھے۔ دیکھو اسی طرح ہم منکرین حق کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں)

ان دونوں اسلوبوں کی بہترین مثال سورہ انفال کی یہ آیت ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ أَنْتَ فِيْهِمْ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ (۳۳)

(اس وقت تو اللہ ان پر عذاب نازل کرنے والا نہ تھا جب کہ تو ان کے درمیان موجود تھا اور نہ اللہ کا قاعدہ ہے کہ لوگ استغفار کر رہے ہوں اور وہ ان کو عذاب دے دے)

یہاں وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ میں پہلا اسلوب اور وَ مَا كَانَ مُعَذِّبَهُمْ میں دوسرا اسلوب کار فرما ہے یعنی کسی نبی کی موجودگی میں قوم پر کبھی عذاب نہیں آسکتا۔ اسی طرح قوم اگر مجموعی طور پر استغفار پر آمادہ ہو تو اللہ خواہ مخواہ انہیں عذاب میں مبتلا نہیں کرتا یہ اس کا مستقل اصول ہے۔

سورہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاءُ (۱۷۹)

Marfat.com

(اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہر گز نہ رہنے دے گا جس میں تم لوگ اس وقت پائے جاتے ہو وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم لوگوں کو غیب پر مطلع کر دے۔ اللہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے)

فرمایا کہ جو جماعت تمام دنیا کی صلاح و فلاح کا ذریعہ بننے والی ہے وہ صالح و فاسد دونوں کا ملغوبہ بنی رہے یہ ناممکن ہے۔ چنانچہ مخلص اہل ایمان کو ابھارنے اور فاسد عناصر کو الگ کرنے کے لیے کوئی تدبیر اختیار کرنا ضروری ہے ایک شکل تو یہ ہو سکتی ہے کہ وہ غیب کا علم دے دے اور ہر آدمی جان جائے کہ مومن کون ہے اور منافق کون، لیکن یہ اللہ کی حکمت کے خلاف ہے۔ غیب کی باتوں کے لیے وہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے اور ان کو امور غیب میں سے جس چیز سے چاہتا ہے آگاہ فرما دیتا ہے۔ اس کی بہترین شکل امتحان ہے۔ چناں چہ مومن و منافق کو چھانٹنے کا اللہ نے ازل سے یہ دستور بنایا ہے کہ وہ انہیں آزمائش میں ڈالتا ہے۔ اللہ کے اس اصول میں کبھی تبدیلی نہیں آسکتی۔

سورہ بقرہ میں فرمایا:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ إِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ (۱۴۳)

(اللہ تعالیٰ تمہارے اس ایمان کو ہر گز ضائع نہیں کرے گا۔ یقین جانو کہ وہ لوگوں کے حق میں نہایت شفیق و رحیم ہے)

یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کو کبھی ضائع اور برباد نہیں کر سکتا وہ تو رحمت و رأفت کا پیکر ہے وہ بھلا اپنے مومن بندوں کو کیوں کر برباد کر سکتا ہے۔

۶- **نفی وقوع:** یعنی کسی چیز کے وقوع کی مکمل نفی ہو۔ مثال کے طور پر سورہ نور میں فرمایا:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لاَ تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (۳۰)

(قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی)

یعنی اللہ کی خلقت میں کسی قسم کا تغیر ممکن نہیں ہے۔

کبھی کبھی اس سے مراد نفی جواز ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ بقرہ میں فرمایا:

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلاَ رَفَثَ وَلاَ فُسُوقَ وَ لاَ جِدَالَ

Marfat.com

فِی الْحَجِ۔ (۱۹۷)

(جو شخص ان مقرر مہینوں میں حج کی نیت کرے اسے خبردار رہنا چاہیے کہ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل، کوئی بد عملی، کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو)

یعنی جو لوگ ان متعین ایام میں حج یا عمرہ کی نیت کریں، وہ ان پابندیوں کو نباہیں ان کے لیے شہوت و نافرمانی اور لڑائی جھگڑا جائز نہیں ہے وہ زیادہ سے زیادہ نیکی اور تقوی کی کمائی کرنے کی کوشش کریں۔

Marfat.com

۱۳- حال

کلام عرب میں حال کے استعمال کی کئی شکلیں ہیں۔ یہاں صرف دو شکلوں کے استعمال پر گفتگو کرنی ہے:

۱۔ کبھی مضاف الیہ سے حال ہوتا ہے۔ جیسے سورہ شعراء میں ہے:

فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ (۴)

(پس ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں)

یہاں خاضعین حال ہے هُمْ مضاف الیہ سے

۲۔ مجرور سے حال ہونا تو کلام عرب میں عام ہے۔ امرؤالقیس اپنے گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے:

فَلَمَّا اجنّ الشَّمْسُ عَنّى غيارها نزلت إليه قائماً بالحضيض (۱۳۹)

(جب سورج غروب ہو گیا تو میں اتر کر اپنے گھوڑے کے پاس آیا اور حال یہ تھا کہ وہ ہموار زمین پر کھڑا تھا)

یہاں قائماً بالحضیضِ حال ہے الیه کی ضمیر مجرور سے۔

اپنے مشہور معلقہ میں وہ کہتا ہے:

كَأَنَّ سَرَاتَهُ لدى البيت قائماً مداك عروس أو صلاية حنظلِ (۱۴۰)

(جب گھوڑا گھر کے پاس کھڑا ہوتا ہے تو اس کی پیٹھ ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے دلہن کی مہندی پیسنے کی سل یا حنظل پھل توڑنے کا چوڑا پتھر)

یہاں بھی قائماً حال ہے سراتهٗ کی ضمیر مضاف الیہ سے۔

اعشی کہتا ہے:

و قيامى عليه غير مضيع قائماً بالغدوّ والآصالِ (۱۴۱)

(اور صبح و شام مستعدی کے ساتھ میری طرف سے اس کی دیکھ بھال ضائع نہ ہو گی)

Marfat.com

اس مثال میں بھی قائماً قیامی کی ضمیر مضاف الیہ سے حال ہے۔

نابغہ بن جعدہ کہتا ہے:

تَلأْ لَأَ کالشعریٰ العبور توقّدت و کان عمـاءً دونهـا فتحسّـرا (۱۴۲)

وہ چمکا جیسے شعریٰ عبور ابر سے نکل کر چمک گیا ہو)

یہاں بھی توقّدث حال ہے الشعری العبور مجرور سے۔

آگے یہی شاعر کہتا ہے:

و نهنهتهٗ حتّی لبستُ مغاضة مضاعفةً کالنّهی ریح و أمطرا(۱۴۳)

(میں نے اسے روکا یہاں تک کہ ایک ڈھیلی ڈھالی زرہ پہنی جس میں اس تالاب کی سی لہریں تھیں جس پر ہوا چلی گئی ہو اور پانی برس گیا ہو)

اس شعر میں ریحَ و أمطرا حال ہے النهی مجرور سے۔

ابو ذویب الهذلی کہتا ہے:

وَ لیأتینّ علیك یـومٌ مـرّة یبکی علیك مقنعا لا تسمعُ (۱۴۴)

(تم پر ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب تم کو دفن کر کے تم پر ماتم کیا جائے گا اور تم کچھ سن نہ سکو گے)

اس شعر میں مقنعًا حال ہے علیك کی ضمیر مجرور سے۔

یہی شاعر اسی قصیدے میں آگے یوں مرثیہ خوانی کرتا ہے:

و بـدالـه اقـراب هـذا رائغًـا عجلاً فعیث فی الکنانة یرجعُ (۱۴۵)

(اور اس کی کمر اس کے سامنے نمایاں ہوئی اس حال میں کہ وہ اِدھر اُدھر پھسل رہی تھی چناں چہ اس نے فوراً ترکش کی طرف ہاتھ بڑھایا)

لبید اپنے معلقہ میں کہتا ہے:

بَاتَتْ و أشبَلَ وَ اکفُ من دیمةٍ یُروی الخمائل دائماً تسجامُها (۱۴۶)

(اور رات ایسی بسر کی کہ وہ جھڑی جو درختوں کی زمینوں اور گھاس والے تھلوں کو تر و تازہ کرے، برابر لگی رہی)

اس شعر میں دائمًا تسجامها حال ہے دیمةٍ مجرور سے۔

Marfat.com

امرؤالقیس اپنے ایک دوسرے قصیدے میں کہتا ہے:

تلاعب اولاد الوعول رباعها　　دوین السّماء فی رء وس المجادل

مکلّلۃً حمراء ذات أسرّۃٍ　　لها حبك كأنها من وصائل (۱۴۷)

(اس کے اونٹ پہاڑی بکروں کے بچوں سے ان پہاڑوں پر دل لگی کرتے ہیں جو آسمان سے بات کرتے ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ ان پر بدلیوں کا سایہ رہتا ہے۔ وہ سرخ ہیں اس کے پودوں میں راستے ہیں جیسے دھاری دار چادریں ہوں۔)

اس میں مکللة حال ہے المجادل مضاف الیہ سے۔

امیۃ بن ابی الصلت کہتا ہے:

فهل تخفی السّماء علی بصیر　　و هل بالشمس طالعةً خفاء (۱۴۸)

(کیا بصیر و علیم خدا پر آسمان مخفی رہ سکتا ہے؟ اور کیا سورج جو طلوع ہو پردۂ خفا میں رہ سکتا ہے؟

اس شعر میں طالعۃً حال ہے بالشمس مجرور سے۔

طرفہ کی بہن خرنق کہتی ہے:

غداة أتاهم بالخیل شعثًا　　یدق نسورها حد القضاض (۱۴۹)

(اس صبح کو جب کہ وہ ان کے اوپر حملہ آور ہوا گھوڑوں سے اس حال میں کہ وہ گرد میں اٹے ہوئے تھے اور ان کے کھر کنکریوں کو اڑا رہے تھے)

یہاں بھی شعثًا حال ہے بالخیلِ مجرور سے۔

اس اسلوب کو قرآن نے جگہ جگہ استعمال کیا ہے:

سورہ قٓ میں ہے:

یَوۡمَ تَشَقَّقُ الۡأَرۡضُ عَنۡهُمۡ سِرَاعًا (۴۴)

(جس دن زمین اوپر سے کھل جائے گی اور حال یہ ہو گا کہ وہ نکلنے میں جلدی کرتے ہوں گے)

یہاں لفظ سراعاً حال ہے عنهم کی ضمیر مجرور سے

علامہ حمیدالدین فراہیؒ کی تاویل کے مطابق سورہ فیل میں بھی یہی اسلوب اپنایا گیا ہے۔ (۱۵۰)

Marfat.com

و أرسَلَ عَلَيهِمْ طيرًا أبَابيل تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سجِّيلٍ (۳-۴)
(اور اس نے ان پر جھنڈ کی جھنڈ چڑیاں بھیجیں اور حال یہ تھا کہ تو ان کے اوپر پتھر پھینک رہا تھا)

اس تاویل کے مطابق ترمیھم حال ہے علیھم کی ضمیر مجرور سے۔

Marfat.com

۱۴۔ وصف

یہ کسی اسم کی خوبی یا خرابی بیان کرنے کے لیے آتا ہے۔اس کی متعدد شکلیں اور فوائد ہیں:

۱۔ بسا اوقات کسی اسم کی صفت اس کے انجام کے اعتبار سے لائی جاتی ہے اگرچہ وہ انجام ابھی پیش نہ آیا ہو۔یہ عربی زبان کا عام اسلوب ہے۔جریر اس اسلوب کو یوں استعمال کرتا ہے:

لولا الخلیفة یا اخیطل ما نجا ایام دجلة شلوك الماکول (۱۵۱)

(اگر خلیفہ میدان دجلہ میں موجود نہ رہا ہوتا تو اے اخیطل تمہارے ریزہ ریزہ حصے نہ بچ پاتے)

یہاں شلوک الماکول میں الماکول کی صفت انجام اور نتیجے کے اعتبار سے آئی ہے ورنہ ظاہر ہے کہ اخیطل میدان دجلہ سے صحیح سلامت واپس آیا تھا۔

اسی اسلوب کو قرآن نے بارہا استعمال کیا ہے۔سورہ انفال میں کہتا ہے۔

لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُولاً (۴۲)

(تاکہ اللہ اس کام کو کردے جو کرنے کا تھا)

سورہ فیل میں ہے:

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاكُولٍ (۵)

(آخرانہیں ایسا کردیا جیسے کھانے کا بھس)

یعنی اس مقابلہ میں اصحاب فیل کو ایسی شکست ہوئی کہ ان کی تمام طاقت پارہ پارہ ہوگئی اور کچھ ہی دنوں کے بعد ان کی حکومت کی بھی دھجیاں اڑ گئیں۔یہ تشبیہ عربی زبان میں بہت مستعمل ہے۔(۱۵۲) عدی بن زید اپنے مشہور قصیدہ میں کہتا ہے:

ثم صاروا کأنهم ورق جفّ فالوت به الصبا والدبور (۱۵۳)

(پھر وہ خشک پتیوں کی مانند ہوگئے جن کو پروا اور پچھوا ہوا اڑائے لیے پھرتی ہے)

۲۔ کبھی کبھی صفت بطور استدلال استعمال ہوتی ہے:سورہ آل عمران میں ہے:

وَمَا النَّصْرُ إِلاَّ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۱۲۶)

(اور مدد صرف اس اللہ کی طرف سے ہوتی ہے جو زبردست ہے دانا ہے)

Marfat.com

یعنی مدد صرف اللہ کی طرف سے آتی ہے اس لیے اہل ایمان کو مطمئن رہنا چاہیے کہ وہ ہمیشہ ان کی مدد کرے گا کیوں کہ وہ عزیز و غالب ہے جس کو چاہے فتح و غلبہ عطا فرمائے کسی کی مجال نہیں کہ اس کا ہاتھ پکڑ سکے لیکن ساتھ ہی وہ حکیم بھی ہے اس وجہ سے اگر اہل ایمان کو کوئی افتاد پیش آجائے تو اس میں بھی کوئی حکمت کار فرما ہوتی ہے۔ اسی مضمون کو سورہ انفال میں اس طرح کھول کر بیان کیا ہے کہ اس سے اس کا استدلالی پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔ فرمایا:

وَ مَا النَّصْرُ إِلاَّ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۱۰)

(مدد جب بھی ہوتی ہے اللہ کی طرف سے ہوتی ہے یقیناً اللہ زبردست اور دانا ہے)

سورۂ جمعہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَافِي السَّمٰوات وَ مَا فِي الْأَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۱)

(اللہ کی تسبیح کر رہی ہے ہر وہ چیز جو زمین و آسمان میں ہے، بادشاہ ہے نہایت مقدس، زبردست اور حکیم)

یہاں بھی خدائی صفات کا تذکرہ استدلال کے لیے ہے۔ یعنی کائنات کی ہر چیز خدا کے آگے سجدہ ریز اور اس کی تسبیح خواں ہے۔ اس لیے کہ وہ پوری کائنات کا تنہا مالک، حاکم اور شہنشاہ ہے۔ تمام بشری لغزشوں اور خامیوں سے پاک ہے۔ مقتدر اور غالب ہے اور حکمت و دانائی والا ہے۔

سورہ صف میں ہے:

يُسَبِّحُ لِلّٰه ما فِي السَّمٰوات وَ مَا فِي الأَرْضِ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱)

(اللہ کی تسبیح کی ہے ہر اس چیز نے جو زمین اور آسمان میں ہے وہ زبردست اور دانا ہے)

اسی طرح سورہ حشر میں بھی اس مضمون کو کھول دیا گیا ہے:

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوات وَالْأَرْضِ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۲۴)

(زمین و آسمان کی تمام چیزیں اس کی تسبیح کرتی ہیں۔ وہ زبردست اور دانا ہے)

سورہ حدید میں یہ استدلال مزید نمایاں ہو گیا ہے:

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوات وَ الْأَرْضِ وَ هُوَ العزيزُ الحكيمُ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوات وَالأَرْضِ يُحْيِيْ وَ يُمِيْتُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شيءٍ قَدِيْرٌ هُو

Marfat.com

الأوَّلُ وَالْآخر وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيءٍ عَلِيْمٌ (۱-۳)

(اللہ کی تسبیح کی ہر اس چیز نے جو زمین اور آسمانوں میں ہے اور وہی زبردست اور دانا ہے۔ زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک وہی ہے۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ وہی اول بھی ہے اور آخر بھی اور ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے)

۲۔ بسا اوقات صفت تخصیص کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر سورہ بقرہ میں ہے:

قَالَ إِنَّهٗ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لاَ فَارِضٌ وَّ لاَ بِكْرٌ عَوَانٌ بين ذَالِك (٦٨)

(موسیٰؑ نے کہا! اللہ کا ارشاد ہے کہ وہ ایسی گائے ہونی چاہیے جو نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا بلکہ اوسط عمر کی ہو)

قَالَ إِنَّهٗ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنها تَسُرُّ النَّاظِرِيْنَ (بقرہ:٦٩)

(موسیٰؑ نے کہا اللہ فرماتا ہے کہ زرد رنگ کی گائے ہونی چاہیے جس کا رنگ ایسا سرخ ہو کہ دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جائے)

إِنَّهَا بَقَرَةٌ لاَ ذَلُولٌ تُثِيْرُ الأَرْضَ وَلاَ تَسْقِى الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لاَ شِيَةَ فِيْهَا (بقرہ : ۷۱)

(وہ ایسی گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی نہ زمین جوتتی ہے نہ پانی کھینچتی ہے۔ صحیح وسالم اور بے داغ ہے)

گائے کی یہ ساری صفات دوسری گایوں سے ممتاز اور منفرد کرنے کے لیے اور تخصیص کے طور پر آئی ہیں جیسا کہ پوچھنے والوں کا اپنی شرارتوں کی وجہ سے مقصود تھا۔ یہی اسلوب سورۂ تحریم کی اس آیت میں بھی ہے:

عَسٰى رَبُّهٗ إِنْ طَلَّقَكُنَّ أَنْ يُّبْدِلَهٗ أَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنَاتٍ قٰنِتٰتٍ عٰبِدَاتٍ سَائِحَاتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا (۵)

(بعید نہیں اگر نبی تم سب بیویوں کو طلاق دے دے تو اللہ اسے اتنی بیویاں تمہارے بدلے میں عطا فرمادے جو تم سے بہتر ہوں سچی مسلمان، باایمان، اطاعت گذار، توبہ گذار، عبادت گذار اور روزہ دار خواہ شوہر دیدہ ہوں یا باکرہ)

Marfat.com

۴۔ کبھی کبھی صفت تاکید کے لیے آتی ہے۔ سورہ الحاقہ میں ہے:

فَإِذَا نُفِخَ فِی الصُّورِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ وَّ حُمِلَتِ الأَرْضُ وَ الْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً (۱۳-۱۴)

(پھر جب ایک مرتبہ صور میں پھونک ماری جائے گی اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا)

سورہ یٰسین میں ہے:

مَا يَنْظُرُوْنَ إِلاَّ صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَأْخُذُهُمْ وَ هُمْ يَخِصِّمُونَ (۴۸)

(دراصل یہ جس چیز کی راہ تک رہے ہیں وہ بس ایک دھماکہ ہے جو یکایک انہیں اس حالت میں دھر لے گا جب یہ (اپنے دنیوی معاملات میں) جھگڑ رہے ہوں گے)

ان تمام آیات میں نفخة واحدة، دكةً واحدةً اور صيحةً واحدةً میں صفات کا استعمال تاکید اور زور پیدا کرنے کے لیے ہے۔

۵۔ بسا اوقات صفت عظمتوں اور خوبیوں کو نکھارنے کے لیے استعمال ہوتی ہے مثال کے طور پر حضور اکرمؐ کا فرمان ہے:

ألاَ أخبركم باحبكم الى و أقربكم منّى مجالس يوم القيامة أحاسن أخلاقاً ألموطئون أكنافاً الذين يألفون و يؤلفون (۱۵۴)

(کیا میں تمہیں یہ نہ بتاؤں کہ قیامت کے دن مجھ سے سب سے زیادہ قریب اور میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟ جو تم میں اخلاق میں سب سے اچھے ہیں، کندھوں کو پست رکھتے ہیں، جو محبت کرتے ہیں اور ان سے محبت کی جاتی ہے)

حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب حضورؐ کی مدح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

و أبيض يُستسقى الغمام بوجهه شمال اليتمٰى عصمة للارامل (۱۵۵)

(وہ گورے مکھڑے والا جس کے روئے زیبا کے واسطے سے ابر رحمت کی دعائیں مانگی جاتی ہیں! وہ یتیموں کا سہارا، وہ بیواؤں اور مسکینوں کا سرپرست)

حضرت حسانؓ بن ثابت کا مشہور شعر ہے:

بيض الوجوه كريمة احسابهم شتم الانوف من الطراز الاول (۱۵۶)

Marfat.com

اور سب سے بہترین مثال سورہ حشر کا آخری رکوع ہے:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِی لاَ إلٰهُ إلاَّ هُو عَالِمُ الغیب وَالشَّهَادَةِ هُوالرَّحمن الرحیم هُو اللّٰه الذی لاَ إلٰه إلاَّ هُو اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُومِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ۔ سبحان اللّٰهِ عَمّا یُشرِكُون ۔ هُو اللّٰهُ الخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الاسماءُ الحُسنٰی یُسَبِّحُ لهٗ ما فی السَّمٰوٰتِ والأَرْضِ وَ هُوَ الْعَزِیْزُالحَكِیمُ۔ (۲۲-۲۴)

(وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ غائب اور ظاہر ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ وہی رحمان و رحیم ہے۔ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ بادشاہ ہے نہایت مقدس ہے سراسر سلامتی، امن دینے والا، نگہبان، سب پر غالب، اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا ہے۔ پاک ہے اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں۔ وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔ اس کے لیے بہترین نام ہیں۔ ہر چیز جو آسمان و زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے)

یہ ساری صفات خدائے وحدہ لاشریک کی عظمت و تقدیس ظاہر کرنے کے لیے ہیں۔

۶۔ صفت مذمت اور تحقیر کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر حدیث نبوی ہے:

ألا أخبر كم بابغضكم إلیّ و أبعد كم منی مجالس یوم القیامة أساؤ كم أخلاقًا الثرثارون المتفیهقون ۔ (۱۵۷)

(کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ میرے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض اور قیامت کے روز سب سے زیادہ دوری پر کون لوگ ہوں گے جو سب سے زیادہ بد اخلاق، بڑے بولنے والے باتونی اور گھمنڈ جتانے والے ہیں)

سورہ قلم میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلاَ تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِیْنٍ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِیْمٍ مَنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ مُعْتَدٍ أَثِیْمٍ عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِیْمٍ۔ (۱۰-۱۳)

(ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت زیادہ قسمیں کھانے والا ہے بے وقعت آدمی ہے،

Marfat.com

طعنے دیتا ہے، چغلیاں کھاتا پھرتا ہے، بھلائی سے روکتا ہے، ظلم وزیادتی میں حد سے گذر جانے والا ہے، سخت بداعمال ہے، جفاکار ہے، اوران سب عیوب کے ساتھ بداصل ہے)

ان آیات میں ساری صفات تحقیر اور مذمت کے لیے استعمال ہوئی ہیں اور کلام عرب میں خاص طور سے ہجویہ قصاید میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔

۷۔ بسااوقات اسم کی جگہ صرف صفت کا استعمال ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ ملک میں ہے:

ألا يَعْلَم من خلق و هو اللَّطِيفُ الخَبِيرُ ۔ (ملك : ۱۴)

(کیاوہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے۔ وہ تو بڑا ہی باریک بیں اور خبر رکھنے والا ہے)

سورہ مرسلات میں ہے:

وَالْمُرْسَلاتِ عُرْفًا فالعٰصفٰتِ عصفًا وَالنّٰشِراتِ نَشْرًا فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا عُذرًا أو نُذرًا (۱-۶)

(شاہد ہیں ہوائیں جن کی باگ چھوڑ دی جاتی ہے پس وہ اڑاتی ہیں غبار اندھا دھند اور شاہد ہیں ہوائیں پھیلانے والی بادلوں کو، پھر وہ معاملہ کرتی ہیں جدا جدا پھر ڈالتی ہیں یاد دہانی اتمام حجت کے طور پر یا آگاہ کر دینے کو)

یہاں موصوف کا تذکرہ نہیں ہے اسی وجہ سے بعض لوگوں نے ملائکہ کو مراد لیا ہے۔ (۱۵۸)

اسی طرح سورہ العادیات میں دیکھیے:

وَالعٰدِيٰتِ ضَبْحًا فَالْمُورِيٰتِ قَدْحًا فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا فَأَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا فَوَسَطْنَ بِهٖ جمعًا (۱-۵)

(گواہی دیتے ہیں ہانپنے، دوڑنے والے گھوڑے، ٹاپوں کی ٹھوکر سے چنگاریاں نکالنے والے، صبح کے وقت دھاوا کرنے والے دوڑ سے غبار اٹھانے والے اور غبار کے ساتھ غول میں گھس جانے والے)

یہاں بھی موصوف محذوف ہے یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں نے اس سے مزدلفہ کے اونٹ مراد لیے ہیں۔ (۱۵۹)

Marfat.com

۱۵- اعتراض

یعنی دوران گفتگو کوئی ایک ایسا لفظ یا جملہ استعمال کرلیا جائے جس کے بغیر بھی گفتگو مکمل ہو سکتی ہو۔ لیکن اسے کسی فائدہ کے پیش نظر درمیان کلام لے آیا گیا ہو۔ بقول سیوطی "اعتراض اس بات کا نام ہے کہ ایک کلام یا دو کلاموں کے مابین دفع ابہام کے سوا کسی اور نکتہ کے لیے ایک جملہ یا ایک سے زیادہ جملے اس طرح لائے جائیں جن کا اعراب میں کوئی محل نہ ہو" (۱۶۰) طیبی نے کتاب التبیان میں لکھا ہے کہ حسین اعتراض کی وجہ بہتر فائدہ دینا ہے اور اسی کے ساتھ اس کا آنا ایک غیر مترقب چیز کا آنا ہے لہٰذا وہ اس وقت ایک ایسی خوبی کی مانند ہو گی جو نا معلوم طور پر یا ایسی سمت سے جہاں سے اس کی آمد کی خبر بھی نہ ہو خود بخود آجائے اور مقصد حاصل ہو جائے۔ (۱۶۱)

یہ اسلوب کلام عرب میں بہت مستعمل ہے۔ نابغہ ذبیانی کا مشہور شعر ہے:

لعمری و ما عمری علی بهیّنٍ لقد نطقت بطلاً علیّ الأقارعُ (۱۶۲)

(خدا کی قسم - اور میرا قسم کھانا کوئی آسان اور معمولی چیز نہیں ہے - بنو قریع بن عوف نے ہمارے خلاف غلط باتیں کہی ہیں)

کثیرؔ کہتا ہے:

لو أن الباخلین و انتِ منهم رأوكِ تعلموا منك المطالا (۱۶۳)

(اگر بخل کرنے والے - اور تم بھی انہیں میں سے ہو - تم کو دیکھ لیتے تو تم سے ٹال مٹول کی صفت سیکھ لیتے)

اعتراض کی بہترین مثال وہ شعر ہے جو کسی نے عبداللہ بن طاہر کی شان میں کہا ہے:

إن الثمانین و قد بلغتها قد أحوجت سمعی الی ترجمان (۱۶۴)

(اسی سال کی عمر نے - اور تم بھی اسی عمر کو پہونچ گئے ہو - میرے کانوں کو ترجمان کا حاجت مند بنا دیا ہے)

نابغہ کے شعر میں و ما عمری علی بهین (اور میرا قسم کھانا کوئی آسان اور معمولی چیز نہیں ہے) جملہ معترضہ ہے۔ بات صرف اتنی کہنی تھی کہ بنو قریع نے نعمان کی خدمت میں میری جو چغلی کھائی ہے اور الٹی سیدھی باتیں کہی ہیں وہ بخدا غلط ہیں۔ لیکن اس جملہ کے اضافے نے مقسم

Marfat.com

بہ کی اہمیت وافادیت کو واضح کر دیا۔

اسی طرح کثیرؔ کے شعر میں اصل کلام صرف اتنا ہے کہ کنجوس لوگ اگر تمہیں دیکھ لیں تو ٹال مٹول اور لیت ولعل کی تمہاری پالیسی سیکھ لیں لیکن و أنت منهم کے جملہ معترضہ نے مفہوم کے اندر مزید زور اور تاثیر پیدا کر دی اور مخاطب کی صحیح تصویر نگاہوں کے سامنے آگئی۔ یہی حال تیسرے شعر کا بھی ہے اس میں و قد بلغتها جملۂ معترضہ ہے۔

قرآن پاک میں اس اسلوب کی نظیریں بہت ہیں۔ چند ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

وَ جَعلُوا بَيْنَهٗ و بَيْنَ الجِنَّةِ نَسبًا و لَقَدْ عَلِمَتِ الجِنَّةُ إِنَّهُم لَمُحضَرُونَ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُونَ إِلاّ عِبَادَ اللّٰهِ المُخلَصِينَ۔ (صافات:۱۵۸-۱۶۰)

(اور انھوں نے خدا اور جنوں کے درمیان بھی رشتہ جوڑ رکھا ہے اور جنوں کو خوب پتہ ہے کہ وہ عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں بجز ان کے جو اللہ کے خاص بندے ہیں)

ان آیات میں سبحٰن اللّٰه عما يصفون بطور جملہ معترضہ ہے اور إلا عبادالله المخلصين کا تعلق و لقد علمت الجنةُ إنهم لمحضرون سے ہے۔ قرآن میں متعدد نظیریں موجود ہیں کہ جب کسی بات کی فوری تردید کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو تردید اصل سلسلۂ کلام کے بیچ آجاتی ہے اس سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ بات ایسی گھنونی ہے کہ متکلم کو اس کی تردید کے معاملہ میں اتنا توقف بھی گوارا نہیں کہ اس کی بات پوری ہو لے۔

یہاں یہ بات انتہائی شنیع اور گھناؤنی تھی کہ جنات کو خدا کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔ اس وجہ سے بلا توقف اس کی تردید فرمادی کہ خدا کی ذات و صفات اس کی تمام نسبتوں سے پاک ہے نہ کوئی اس کی ذات میں شریک ہے نہ صفات میں؛ وہ بالکل وحدہ لاشریک ہے اس وجہ سے وہ اپنے حقوق میں بالکل یکتا و لاشریک ہے۔ (۱۶۵) سورہ روم میں فرمایا:

فَسُبحٰنَ اللّٰهِ حِينَ تُمسُونَ وَ حِينَ تُصبِحُونَ وَ لَهُ الحَمدُ فِى السَّمٰوَاتِ وَالأَرضِ وَ عَشِيًّا وَّ حِينَ تُظهِرُونَ (روم: ۱۷-۱۸)

(پس اللہ ہی کی تسبیح کرو جس وقت تم شام کرتے اور جس وقت صبح کرتے ہو اور آسمانوں اور زمین میں اسی کی حمد ہو رہی ہے اور عشاء کے وقت بھی اور اس وقت بھی جب تم ظہر کرتے ہو)

یہاں اوقات تسبیح کے درمیان وله الحمد فى السماوات والأرض ایک جملہ معترضہ ہے جو بطور تنبیہ و تذکیر وارد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ہی کی تسبیح کی جو دعوت دی جارہی ہے یہ کوئی

Marfat.com

بیگانہ دعوت نہیں ہے بلکہ آسمانوں اور زمین کے ہر گوشے سے خدا ہی کی حمد کا ترانہ گونج رہا ہے اس لیے جو لوگ خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کر رہے ہیں ان کا سُر اس کائنات کے مجموعی سُر سے بالکل بے جوڑ ہے۔ دوسری طرف دعوت کا انکار کرنے والوں سے ایک قسم کی بیزاری کا اظہار بھی ہے۔

سورہ انعام میں فرمایا:

وَ جعلوا لِلّٰهِ شرکآءَ الجِنّ وَ خَلَقَهُم وَ خَرَقُوا لَهٗ بَنِینَ وَ بَنَاتٍ بِغَیرِ عِلمٍ سُبحٰنَهٗ وَ تعالیٰ عمّا یَصِفُونَ (انعام: ۱۰۰)

(اور انھوں نے جنوں میں سے خدا کے شریک ٹھیرائے حالاں کہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا اور اس کے لیے بے سند بیٹے اور بیٹیاں تراشیں وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں)

یہاں و خلقھم کی حیثیت کلام کے بیچ میں جملہ معترضہ کی ہے یہ بات اتنی گھناؤنی تھی کہ بلا تاخیر اس کی تردید فرمادی کہ یہ لوگ جنوں کو خدا کا شریک ٹھیراتے ہیں حالاں کہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا ہے۔ خدا ہی کی مخلوق آخر اس کی خدائی میں شریک کیسے بن سکتی ہے؟ سورہ واقعہ میں فرمایا:

فَلَآ اُقسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّو تَعلَمُونَ عَظِیمٌ اِنَّهٗ لَقُرآنٌ کَرِیمٌ فِی کِتَابٍ مَّکنُونٍ (واقعہ: ۷۵-۷۸)

(پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے گرنے کے ٹھکانوں کی! اور بے شک یہ ایک بہت بڑی قسم ہے اگر تم جانو! بے شک یہ ایک باعزت قرآن ہے ایک محفوظ کتاب میں)

یہاں فلا أقسم بمواقع النجوم کے بعد و إنه لقسم لو تعلمون عظیم قسم اور مقسم علیہ کے درمیان ایک برمحل جملہ معترضہ ہے۔ فرمایا کہ اگر تم جان سکو تو یہ حقیقت تم پر آشکارا ہوگی کہ یہ قسم اپنے اندر ایک عظیم شہادت اس بات کی رکھتی ہے کہ جنات و شیاطین کو ملأ اعلیٰ تک کوئی رسائی حاصل نہیں ہے۔ سورہ لقمان میں فرمایا:

وَ وَصَّینَا الاِنسَانَ بِوَالِدَیهِ حَمَلَتهُ اُمُّهٗ وَهنًا عَلٰی وَهنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِی عَامَینِ اَنِ اشکُر لِی وَلِوَالِدَیکَ اِلَیَّ المَصِیرُ (لقمان: ۱۴)

(اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے معاملہ میں ہدایت کی، اس کی ماں نے دکھ پر دکھ جھیل کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا کہ میرے شکر گزار رہو اور اپنے والدین کے، میری ہی طرف بالآخر لوٹنا ہے)

اس آیت میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی جب وصیت کی گئی تو جملہ معترضہ کے طور

Marfat.com

پر بچے کی پیدائش اور تربیت میں ماں کی کلفتوں اور پریشانیوں کا تذکرہ بھی کر دیا تاکہ ماں کی فضیلت اور مقام و مرتبہ کا بچے کو پوری طرح احساس ہو اور اس کی اطاعت میں بچے کو ناگواری کا احساس نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث میں ماں کا درجہ سب سے اونچا قرار دیا گیا ہے اور حسن سلوک اور حسن معاشرت کا سب سے زیادہ حقدار ماں کو بتایا گیا ہے۔ سورہ بقرہ میں دیکھیے:

وَ إِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيهَا وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ ما كُنتُمْ تَكْتُمُونَ۔ (بقرہ:۷۲)

(اور یاد کرو جب کہ تم نے ایک نفس کو قتل کر دیا پھر اس کے بارے میں ایک دوسرے پر الزام بازی کی حالاں کہ اللہ وہ سب کچھ ظاہر کرنے والا ہے جو چھپاتے رہے ہو)

اس آیت میں **واللہ مخرج ما کنتم تکتمون** بطور جملہ معترضہ کے ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو قتل کر کے تم دنیا میں ایک دوسرے پر الزام بازی کر کے اس کو چھپانے کی کوشش کر سکتے ہو حالاں کہ یاد رکھو کہ کوئی چیز اگر تم نے دنیا میں چھپالی تو وہ ہمیشہ مخفی نہیں رہے گی بلکہ ایک دن اللہ وہ سب کچھ ظاہر کر کے رہے گا جو تم چھپا رہے ہو۔

پھر یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ چھوٹے جملے بھی اعتراض کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور طویل مضامین بھی البتہ سب ماقبل و مابعد سے مربوط ہوتے ہیں مثال کے طور پر سورہ اعراف میں دیکھیے:

حضرت موسیٰؑ کی داستان بیان ہو رہی ہے اور اس عہد و میثاق کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جو بنی اسرائیل سے آئندہ آنے والے انبیاء پر ایمان لانے کے لیے لیا گیا تھا۔ فرمایا:

قَالَ عَذَابِي أُصِيبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَ رَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَ يُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ (اعراف: ۱۵۶)

(فرمایا میں اپنے عذاب میں تو اسی کو مبتلا کرتا ہوں جس کو چاہتا ہوں اور میری رحمت ہر چیز کو عام ہے سو میں اس کو ان لوگوں کے لیے لکھ رکھوں گا جو تقویٰ اختیار کریں گے اور زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے)

اس کے بعد آگے کی آیت ۱۵۷ میں بطور اعتراض اس امر کی بھی تصریح کر دی کہ **وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ** کے مصداق کون لوگ ہیں فرمایا:

اَلَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهٗ مَكْتُوبًا فِي التَّوراةِ وَ الْإِنجِيلِ وَ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَ يَنْهَاهُم عَنِ الْمُنكَرِ وَ

Marfat.com

يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ و يُحَرِّمُ عَلَيهِم الخَبَائِثَ وَ يَضَعُ عَنهُم إِصرَهُم وَ الأغلاَلَ الَّتِي كَانت عَلَيهِم فالَّذينَ آمنوا بِهٖ و عزّرُوهُ و اتَّبعُوا النُّورَ الَّذِيٓ أُنزِلَ مَعهُ اولٰئِكَ هُمُ المُفلِحُونَ ۔ (۱۵۷)

(جو پیروی کریں گے اس نبی امی رسول کی جسے وہ اپنے یہاں تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے برائی سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں جائز ٹھیراتا ہے اور خبیث چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور پابندیاں اتارتا ہے جو ان پر اب تک رہی ہیں تو جو اس پر ایمان لائے، جنھوں نے اس کی مدد کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتاری گئی ہے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں)

اور جب بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر تک پہنچ گئی تو برسر موقع بطور جملہ معترضہ آپ کی زبان مبارک سے بنی اسرائیل کو ایمان لانے کی دعوت بھی دلوادی گئی:

قُلْ يا أيُّهَا النَّاسُ إنِّی رَسُولُ اللّٰهِ إليكُم جميعًا ألَّذِیْ لَهٗ مُلكُ السَّمٰوٰاتِ وَالأرْضِ لا اله إلاَّ هُوَ يُحْيِی وَ يُمِيتُ فآمِنُوا بِاللّٰهِ وَ رَسُولِهِ النَّبِیِّ الأمِّیِّ ألَّذِی يُومِنُ بِاللّٰهِ و كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوهُ لعلّكُم تَهْتَدُونَ ۔ (۱۵۸)

(کہہ دو، اے لوگو، میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں اس اللہ کا جس کے لیے ہی آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے وہی جلاتا اور وہی مارتا ہے پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے نبی امی رسول پر جو ایمان رکھتا ہے اللہ اور اس کے کلمات پر اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم راہ یاب ہو)

لیکن اس کے بعد آیت ۱۵۹ سے پھر اصل مضمون شروع ہو گیا اور موسیٰؑ کی داستان کا سلسلہ قائم ہو گیا۔

اسی طرح سورہ مریم میں دیکھیے۔ ۱٦ سے ۳۳ تک حضرت مریم علیہا السلام کی سرگذشت بیان ہوئی ہے اس کے بعد دو آیات حضرت مسیح کے ارشادات کے درمیان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور جملہ معترضہ ہیں۔ فرمایا:

ذٰلِكَ عِيسَى ابنُ مَرْيَمَ قَولَ الْحَقِّ الَّذِیْ فِيهِ يَمْتَرُونَ مَا كَانَ لِلّٰهِ أن يَتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ سُبحٰنَهٗ إذا قَضٰی أمرًا فإنّما يَقُولُ لَهٗ كُنْ فيَكُونَ ۔ (۳۵،۳۴)

(یہ ہیں عیسیٰؑ ابن مریم۔ یہ اصل حقیقت بیان ہوئی ہے جس میں یہ لوگ جھگڑ رہے ہیں۔

Marfat.com

خدا کے شایان نہیں کہ وہ کوئی اولاد بنائے، وہ پاک ہے۔ جب وہ کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس اس کو فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے)

یعنی عیسیٰ ابن مریم کی اصل حقیقت وہ ہے جو اللہ نے بیان فرمائی اور خود حضرت مسیح نے واضح کر دی لیکن عیسائیوں نے اسے افسانہ وناول بنا دیا اور خود بھی اوہام و خرافات میں مبتلا ہوئے اور دوسروں کو بھی مبتلا کیا۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کے ارشادات کا آخری ٹکڑا نقل ہوا ہے۔

سورہ بقرہ میں آیات ۲۴۳ تا ۲۸۳ میں مسلمانوں کو خانہ کعبہ کی آزادی کے لیے جہاد پر ابھارا گیا ہے اور اس جہاد کے مقصد سے انفاق کا جذبہ بھڑکایا گیا ہے۔ بنی اسرائیل نے اپنے قبلہ کو فلسطینیوں سے آزاد کرانے کے لیے جو جنگ لڑی اس کا حوالہ دیا گیا ہے لیکن درمیان میں اصل سلسلہ کلام کو روک کر بطور اعتراض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا گیا:

تِلْكَ آيَاتُ اللّٰهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَ إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ وَ آتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ وَ لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوا فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ وَ مِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوا وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ (بقرہ: ۲۵۲،۲۵۳)

(یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمہیں سناتے ہیں مقصد کے ساتھ اور بے شک تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو۔ یہ رسول جو ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ان میں سے بعض سے اللہ نے کلام کیا اور بعض کے درجے بلند کیے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے اس کی تائید کی اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے واضح دلائل کے بعد نہ لڑتے لیکن انھوں نے اختلاف کیا۔ سو ان میں سے کچھ ایمان لائے اور کچھ نے کفر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ اختلاف نہ کر پاتے لیکن اللہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے)

اس کے بعد انفاق کا مضمون از سر نو آ گیا ہے۔

یہاں اس اعتراض کا فائدہ یہ ہوا کہ رسولوں کی صحیح حیثیت متعین ہو گئی اور اس صحیح رویے کی وضاحت ہو گئی جو ان خدائی پیغمبروں کے بارے میں ان کی امتوں کو اختیار کرنا تھا۔

Marfat.com

۱۶- تکمیل

یعنی متکلم کوئی بات محتاط اور معتدل انداز میں کہے لیکن اس سے بات پوری ہوتی نظر نہ آرہی ہو یا کوئی التباس ہو رہا ہو اور مخاطب کے شبہ میں مبتلا ہونے یا غلط مفہوم سمجھ لینے کا اندیشہ ہو تو وہ اس کی وضاحت کر کے بات کو مکمل کر دے اس کو احتراس بھی کہا جاتا ہے۔ علامہ سیوطی کے الفاظ میں تکمیل یہ ہے کہ ایسے کلام میں جو خلاف مقصود ہونے کا وہم پیدا کرتا ہو، کوئی ایسی بات بیان کی جائے جو اس وہم کو ختم کر دے۔ (۱۶۶) کلام عرب میں اس اسلوب کی مثالیں بہت ہیں۔

متنبّی کہتا ہے:

إنی أُصاحب حلمی و هو بی کرم ولا أصاحب حلمی وهو بی جبن (۱۶۷)

(میں حلم و بردباری اختیار کرتا ہوں جب کہ اس سے سخاوت چھوٹتی ہو لیکن اگر اس سے بزدلی آشکارا ہو تو میں حلم کا دامن چھوڑ دیتا ہوں)

اس مثال میں دوسرا شعر ایک غلط فہمی دور کرنے کے لیے وارد ہوا ہے۔

عبداللہ بن معتز گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے:

صبینا علیها ظالمین سیاطنا فطارت بها اید سراع وارجل (۱۶۸)

(ہم نے اپنے گھوڑوں پر کوڑے برسائے حالاں کہ ہمارا یہ فعل سراسر ظلم تھا چناں چہ تیز رفتار ہاتھ پاؤں انھیں لے کے اڑ گئے)

اس شعر میں اگر ظالمین کو نکال دیا جائے تو سامع کو یہ غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ شاعر کے گھوڑے کند ذہن اور سست رفتار تھے حالاں کہ شعر کا مقصود یہ نہ تھا چناں چہ ظالمین کے ذریعہ اس غلط فہمی کو دور کر دیا گیا۔

عنترہ کہتا ہے:

یخبرك من شهد الوقیعة أننی أغشی الوغیٰ و أعف عند المغنم (۱۶۹)

(جو لوگ میدان جنگ میں موجود رہے ہیں وہ تمہیں بتائیں گے کہ میں جنگ کے میدان میں

Marfat.com

کو دیڑتا ہوں لیکن مال غنیمت سے دور رہتا ہوں کیوں کہ میں اس کی خاطر جنگ نہیں کرتا)

اس شعر میں و أعف عند المغنم احتراس یا تکمیل کے طور پر وارد ہوا ہے اور مقصد اس امر کی تردید ہے کہ شاعر جنگ میں مال غنیمت کی خاطر شجاعت کے جوہر دکھائے۔

محمد بن کعب غنوی کہتا ہے:

حلیم إذا ما الحلم زیّن أهله　　　مع الحلم في عين الرجال مهيب (۱۷۰)

(وہ بردبار رہے جب کہ بردباری انسان کی زینت میں اضافہ کرتی ہو اور افراد کی نگاہ میں وہ خوفناک بھی ہے)

یہاں في عين الرجال مهيب کے جملہ نے ہر وہم کو دور کر دیا کہ یہ حلم و بردباری کسی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی شرافت طبع کی پیداوار ہے ورنہ وہ خطرناک اور خوفناک بھی ہے۔

قرآن نے اس اسلوب کو نہایت عمدگی سے استعمال کیا ہے۔ سورہ مائدہ میں کہتا ہے:

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهٖ فَسَوْفَ يَاتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّونَهٗ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ ۔

(مائدہ: ۵۴)

(اے ایمان والو، جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ کو کوئی پروا نہیں، وہ جلد ایسے لوگوں کو اٹھائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے وہ مسلمانوں کے لیے نرم مزاج اور کافروں کے مقابلے میں سخت ہوں گے۔)

ایک حدیث میں ہے کہ المؤمن غرٌ کریمٌ یعنی مومن اپنے دوسرے بھائی کے لیے بھولا بھالا اور شریف و کریم ہوتا ہے وہ مسلمانوں کے لیے نرم خو، نرم مزاج اور ہر پہلو سے لچک قبول کرنے والا اور ہر سانچے میں ڈھل جانے والا ہوتا ہے لیکن کوئی اس سے یہ نہ سمجھے کہ وہ اسلام دشمنوں کے ہاتھوں میں موم کی ناک اور کٹھ پتلی ثابت ہوگا اور وہ جس طرح چاہیں گے اس کو موڑیں گے اور جس طرح اس کو چاہیں گے نچائیں گے بلکہ کفر اور باطل کے مقابلے میں وہ پتھر کی چٹان ہوگا وہ اگر اپنے اغراض و مقاصد کے لیے اسے استعمال کرنا چاہیں گے تو کہیں سے انگلی دھنسانے کی جگہ نہ پاسکیں گے۔ یہاں أعزةٍ على الكافرين کی صفت تکمیل کے لیے یا احتراس کے لیے آئی ہے۔

یہی بات سورہ فتح میں بھی بیان ہوئی ہے اور وہاں بھی یہی اسلوب کار فرما ہے۔ فرمایا:

Marfat.com

محمدٌ رَسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ معهٗ أشدّآء عَلى الكفّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ

(فتح:۲۹)

(محمد اللہ کے رسول اور جوان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحمدل ہیں)

یہاں رحمآء بینھم کے ذریعے اس امر کی وضاحت ہو گئی کہ ان کی یہ سختی اور فولادیت باطل کے خلاف ہے آپس میں تو وہ بالکل نرم اور سہل الانقیاد ہیں، سیدنا مسیح نے اپنے ساتھیوں کو یہ جو ہدایت فرمائی تھی کہ کبوتر کی مانند بے آزار اور سانپ کی مانند ہوشیار بنو اس میں بھی یہی دونوں پہلو ملحوظ تھے۔

سورہ طٰہٰ میں ہے:

وَاضْمُمْ يَدكَ إلى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيةً أُخرٰى

(طٰہٰ : ۲۲)

(اور اپنے ہاتھ کو اپنے بازو کی طرف سکیڑ لو، وہ وہاں سے ایک دوسری نشانی بن کر، چٹا سفید، بغیر کسی مرض کے بر آمد ہو گا)

یہاں بیضاء کے ساتھ من غیر سوءٍ کی قید نہ ہوتی تو تورات کی اس روایت کی تردید نہ ہو پاتی کہ جب حضرت موسیٰ نے اپنا ہاتھ نکالا تو وہ برص سے سفید نکلا۔ من غیر سوءٍ کے اس اضافہ نے اس روایت کو بے بنیاد قرار دے دیا اور اس امر کی صراحت ہو گئی کہ ہاتھ کی یہ سفیدی کسی مرض کے سبب سے نہ ہو گی بلکہ اللہ کی ایک نشانی کے طور پر ہو گی۔

سورہ نمل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی سرگذشت بیان ہوئی ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ کی فوجیں مارچ کرتی ہوئی چیونٹیوں کی وادی میں پہنچیں تو ایک چیونٹی نے اپنے دَل کو خطرے سے آگاہ کیا کہ اے چیونٹیو! اپنی بلوں میں گھس جاؤ مبادا سلیمان اور اس کی فوجیں بے خبری میں تمہیں پامال کر دیں۔

حَتّٰى إذَا أتَوا عَلى وَادِى النَّمْلِ قَالَتْ نملةٌ يآ ايُّهَا النَّملُ ادْخلُوْا مَسَاكِنكُمْ لا يَحْطِمَنَّكُم سُلَيمٰنُ وَ جُنودُهٗ وَ هُمْ لاَ يَشْعُرُوْنَ (نمل:۱۸)

(یہاں تک کہ جب وہ چیونٹیوں کی وادی میں پہونچے، ایک چیونٹی نے کہا، اے چیونٹیو!

Marfat.com

اپنے سوراخوں میں گھس جاؤ کہ سلیمانؑ اور ان کا لشکر تمہیں بے خبری میں پامال نہ کر ڈالے)

یہاں و ھم لا یشعرون کے اضافہ نے حضرت سلیمانؑ کی جانب ظلم کے توہم کو ختم کر دیا۔

اسی طرح سورہ منافقون میں ہے:

إذا جاءَكَ المُنافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهٗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَكٰذِبُونَ(۱)

(جب منافق تمہارے پاس آتے ہیں، کہتے ہیں، ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک تم اس کے رسول ہو اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین بالکل جھوٹے ہیں)

یہاں وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولهٗ کا جملہ احتراس کے طور پر وارد ہوا ہے تاکہ کسی کو یہ وہم نہ ہو سکے کہ تکذیب کی زد خود نفس مضمون پر پڑ رہی ہے۔ یہ منافقین اپنی شہادت میں جھوٹے ہیں لیکن جہاں تک تمہارے رسول ہونے کا تعلق ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ان کی شہادت کی محتاج نہیں ہے۔ اللہ کو خوب علم ہے کہ تم اس کے رسول ہو البتہ یہ منافقین اپنی شہادت میں جھوٹے ہیں کیوں کہ ان کا طرز عمل ان کی شہادت کے بالکل خلاف ہے۔

سورہ تغابن میں فرمایا:

إِنَّمَا أَمْوَالُكُم وَ أَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللّٰهُ عِندَهٗ أَجرٌ عظيمٌ (۱۵)

(تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے فتنہ ہیں اور اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے)

یہاں وَاللّٰهُ عِندَه أَجرٌ عظيمٌ کے اضافہ نے اس وہم کو دور کر دیا کہ مال و اولاد سے یکسر قطع تعلق اور مفارقت کی روش اختیار کی جائے فرمایا کہ جس حد تک گنجائش ہو عفو و درگذر اور چشم پوشی سے کام لیا جائے اور مال و اولاد کو خدا کی راہ میں لگایا جائے کہ اسی میں فوز و فلاح ہے یہ راہ اختیار کر کے اس دنیا میں کوئی نقصان بھی اٹھاؤ گے تو اطمینان رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر نقصان کی تلافی آخرت میں اجر عظیم سے فرمائے گا۔

Marfat.com

۱۷- عطف بالواوَ

اس عطف کے عمومی فوائد تو نحو کی کتابوں میں ملیں گے البتہ یہاں کچھ خاص فوائد اور حکمتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو عام اصولوں سے ہٹ کر ہیں تاکہ اس اصول کے بعض اسرار و حکم کا تجزیہ ہو سکے جو غور و تدبر سے سامنے آتے ہیں۔

۱۔ اس عطف کا ایک فائدہ توضیح و تبیین ہے یعنی یہ معطوف علیہ کی وضاحت کے لیے آتا ہے مثال کے طور پر سورۂ توبہ میں فرمایا گیا:

و إذا أنزِلَتْ سُوْرَةٌ أنْ آمِنُوا باللّٰهِ وَ جَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ إسْتَأذَنكَ أُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُم وَ قَالُوا ذَرْنَا نَكُنْ مَعَ القَاعِدِيْنَ۔ (۸۶)

(اور جب کوئی سورہ نازل ہوتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ جہاد کے لیے نکلو تو ان میں کے جو مقدرت والے ہیں وہ بھی تمہارے پاس رخصت مانگنے آ کھڑے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دیجیے ہم بیٹھنے والوں ہی کے ساتھ رہیں گے)

اس آیت میں **وجهادوا مع رسوله ، آمنوا باللّٰه** کی عملی توضیح ہے یعنی جب کوئی حصہ قرآن ان سے مطالبہ کرتا ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ جس کا ثبوت یہ ہے کہ اللہ کے رسول کے ساتھ ہو کر جہاد کے لیے نکلو تو یہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔

دوسرے ٹکڑے میں **و قالوا ذرنا نكن مع القاعدين** تشریح و توضیح ہے **إستاذنكَ** کی یعنی مقدرت اور مال والے اور توانا جسم رکھنے والے اور سامان جنگ فراہم کرنے کا وافر ذریعہ رکھنے والے اجازت طلب کرنے لگتے ہیں یعنی وہ نکلنے والے غازیوں کا ساتھ نہیں دینا چاہتے بلکہ بیٹھ رہنے والے بزدلوں ناکارہ لوگوں اور معذوروں کے ساتھی بننا چاہتے ہیں اور طرح طرح کے بہانے تراش کر رخصت مانگنے آ موجود ہوتے ہیں۔

سورہ بقرہ میں فرمایا:

يآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوا مَا بَقِىَ مِنَ الرِّبٰوا إن كُنتُم مُؤمنِيْنَ(۲۷۸)

(اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور جو سود تمہارا باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم سچے مومن ہو)

Marfat.com

اس آیت میں و ذروا ما بقی من الربٰوا عملی تفسیر ہے اِتقوا اللّٰہ کی۔اہل ایمان کو براہ راست خطاب کر کے اللہ سے ڈرتے رہنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے جس کی عملی تفسیر یہ بتائی گئی کہ جو کچھ سود رہ گیا ہے اس سے دست بردار ہو جاؤ کیوں کہ یہ چیز تقویٰ کے منافی ہے اور پھر آگے کی آیت میں یہ دھمکی بھی دی گئی کہ اب جو لوگ اس حکم کو نہ مانیں گے وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کے لیے خبردار ہو جائیں۔

عطف کا یہ اسلوب سورہ توبہ میں بھی دیکھیے:

یَـٰٓا اَیُّھَا الَّذِیۡنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ (۱۱۹)

(اے ایمان والو، اللہ سے ڈرتے رہو اور راست بازوں کی معیت اختیار کرو)

یہاں بھی آخر کا جملہ معطوف علیہ کی توضیح کے لیے ہے یعنی اللہ سے ڈرو جس کا تقاضہ یہ ہے کہ کافروں، جاہلوں اور منافقوں کی معیت اختیار کرنے کے بجائے راست بازوں کی صحبت و معیت اور راسخ الایمان اور کامل الحیاء لوگوں کی رفاقت اختیار کرو۔ ہمارے اس قول کی وضاحت بعد کی دو آیات سے بخوبی ہو جاتی ہے فرمایا:

مَا کَانَ لِأَھۡلِ الۡمَدِیۡنَةِ وَ مَنۡ حَولَھُم مِنَ الأعرَابِ أنۡ یَّتَخَلَّفُوا عَن رَّسُولِ اللّٰهِ وَ لاَ یَرغَبُوا بِأنۡفُسِھِم عَنۡ نَفۡسِهٖ ذٰلِكَ بِأنَّھُم لاَ یُصِیۡبُھُمۡ ظَمَأٌ وَلاَ نَصَبٌ وَّلاَ مَخۡمَصَةٌ فِی سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَ لاَ یَطَئُونَ مَوۡطِئًا یَغِیۡظُ الۡکُفَّارَ وَلاَ یَنَالُونَ مِنۡ عَدُوٍّ نَّیۡلاً إلاَّ کُتِبَ لَھُم بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ إنَّ اللّٰهَ لاَ یُضِیۡعُ أجرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ وَلاَ یُنۡفِقُونَ نَفَقَةً صَغِیۡرَةً وَ لاَ کَبِیۡرَةً وَلاَ یَقۡطَعُونَ وَادِیًا إلاَّ کُتِبَ لَھُمۡ لِیَجۡزِیَھُمُ اللّٰهُ أحۡسَنَ مَا کَانُوا یَعۡمَلُونَ۔ (توبہ: ۱۲۰، ۱۲۱)

"اہل مدینہ اور اس کے گرد و نواح کے اعراب کے لیے روانہ تھا کہ وہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر پیچھے بیٹھ رہیں اور نہ یہ کہ اپنی جان کو اس کی جان سے عزیز رکھیں، یہ اس لیے کہ جو پیاس، تکان اور بھوک بھی خدا کی راہ میں ان کو لاحق ہوتی ہے اور جو قدم بھی وہ کفار کو رنج پہنچانے والا اٹھاتے ہیں اور جو چرکا بھی کسی دشمن کو لگاتے ہیں، ان سب کے بدلے میں ان کے لیے ایک نیکی لکھی جاتی ہے اللہ خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا اور جو کوئی چھوٹا یا بڑا انفاق وہ کرتے ہیں اور جو وادی بھی وہ قطع کرتے ہیں، سب ان کے لیے لکھا جاتا ہے تا کہ اللہ ان کے عمل کا اچھے سے اچھا بدلہ دے۔"

Marfat.com

۲۔ عطف کا ایک فائدہ یہ ہے کہ معطوف میں نتیجہ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کہتا ہے:

رَضُوا بِأَنْ يَّكُونُوا مَعَ الخَوالِفِ وَ طُبِعَ عَلى قُلُوبِهِمْ فَهُم لَايَفْقَهُونَ (توبہ:۸۷)

(انھوں نے اس بات کو پسند کیا کہ پیچھے رہ جانے والیوں کے ساتھی بنیں اور ان کے دلوں پر مہر لگادی گئی ہے تو اب وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں)

یعنی ان منافقوں نے غازیوں کی ہم سفری و ہم رکابی کے بجائے عورتوں کی طرح گھر میں بیٹھ رہنے کو ترجیح دی تو ان کی اس اخلاقی و ایمانی موت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دلوں پر ٹھپہ لگادیا گیا نہ اب وہ کوئی صحیح بات سوچتے ہیں نہ کسی عزم و ہمت والے کام کے لیے ان میں حوصلہ ہی پیدا ہوتا ہے اسی مفہوم کو آگے آیت ۹۳ میں پھر دہرایا گیا ہے:

رَضُوا بِأَنْ يَّكُونُوا مَعَ الخَوالِفِ وَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلى قُلُوبِهِمْ فَهُم لَايَعْلَمُونَ (توبہ:۹۳)

(یہ لوگ خانہ نشین عورتوں کے ساتھ بیٹھے رہنے پر راضی ہوئے اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کردی پس وہ علم سے محروم ہوگئے)

۳۔ جب شرط اور جواب شرط میں کمال اتصال دکھانا مقصود ہو تو جواب شرط پر حرف عطف واؤ داخل کردیتے ہیں یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ان دونوں افعال میں کوئی وقفہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر سورہ صٰفّٰت میں فرمایا:

فَلَمَّا اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلجَبِيْنِ (۱۰۳)

(پس جب دونوں نے اپنے تئیں اپنے رب کے حوالے کردیا اور ابراہیمؑ نے اس کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا)

یہاں و تلهٗ للجبین اصل میں لما کا جواب ہے لیکن شرط اور جواب شرط میں کمال اتصال کا مظاہرہ کرنے کے لیے عام قاعدے سے ہٹ کر واؤ حرف عطف داخل کردیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ حضرت ابراہیم نے پیشانی کے بل پچھاڑنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی بلکہ فوراً رضائے الٰہی کی طلب کے لیے بے قرار ہو کر یہ مبارک اقدام کر ڈالا۔ (۱۷۱)

اسی طرح سورہ زمر میں فرمایا:

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوا رَبَّهُم إلى الجَنَّةِ زُمَرًا حَتّٰى إذَا جَاءُ وهَا وَ

Marfat.com

فُتِحَتْ أَبْوَابُها وَقَال لَهُم خَزَنَتُهَا سَلاَمٌ عَلَيكُم طِبتُم فَادْخُلُوهَا خَالِدِيْنَ (زمر:۷۳)

(اور جن لوگوں نے اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی گذاری وہ گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آئیں گے تو اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور اس کے پاسبان سلام کے ساتھ ان کا خیر مقدم کریں گے کہ مبارک ہو اس میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جایئے)

یہاں و فتحت ابوابها جواب شرط ہے إذا کا(۱۷۲)۔ لیکن اس پر واؤ داخل کر دیا ہے یہ بتانے کے لیے کہ جنتیوں اور جنت کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہو گی وہ پہنچیں گے تو جنت اپنی تمام جلوہ طرازیوں اور آرائشوں کے ساتھ استقبال کے لیے موجود ہو گی۔

۴۔ علت: کہیں کہیں واؤ عطف علت اور سبب بتانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ اعراف کی یہ آیت دیکھیے:

فَالْيَوْمَ نَنْسَاهُم كَمَا نَسُوا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هذا وَ مَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ (اعراف : ۵۱)

(آج بھی ہم انہیں اسی طرح بھلا دیں گے جس طرح وہ اس دن کی ملاقات کو بھولے رہے اور بسبب اس کے کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے)

یہاں **و ما کانوا بآیاتنا یجحدون** سبب بتانے کے لیے آیا ہے (۱۷۳) یعنی ہم انہیں آج اس لیے نظر انداز کر رہے ہیں کہ انھوں نے دنیوی زندگی میں لہو و لعب کیا، آخرت کے دن کو بھولے رہے اور ہماری آیات کا مسلسل انکار کرتے رہے اس لیے آج قیامت کے دن یہ کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔

اس آیت کے پہلے ٹکڑے میں فرمایا ہے:

اَلَّذِيْنَ اتَّخَذُوا دِيْنَهُم لَهْوًا وَّ لَعِبًا وَّ غَرَّتْهُمُ الحَيٰوةُ الدُّنيَا (اعراف:۵۱)

(جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشہ بنایا اور جن کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈالے رکھا)

یہاں واؤ سببیہ ہے یعنی معطوف میں اس لاابالیانہ طرز عمل کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ وہ کیوں ٹھوس حقائق سے منہ چرائے رہے فرمایا کہ دنیا کی زندگی نے انہیں دھوکے میں رکھا۔ انھوں نے اسی دنیا کی زیب و زینت کو سب کچھ سمجھ لیا اور اگر کسی نے انہیں یوم آخرت کی طرف توجہ دلائی تو اسے دیوانہ اور خبطی کہہ دیا اور پھر اپنی خرمستیوں میں یہ کہتے ہوئے جا پڑے کہ "بازی بازی باریش بابا ہم بازی"۔

Marfat.com

۱۸- ابہام کے بعد توضیح

یہ اسلوب قرآن پاک اور کلام عرب میں بہت عام ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مخاطب کو اپنی طرف متوجہ کرنے یا اسے ورطہ حیرت میں ڈالنے کے لیے کسی چیز کا مبہم تذکرہ کیا جاتا ہے اور جب مخاطب کے اندر تجسس پیدا ہو جاتا ہے تو فوراً اس کی تفصیل کر دی جاتی ہے تاکہ اس کی حیرانی و سرگشتگی دور ہو سکے اس سے اس چیز کی اہمیت وافادیت بھی سامنے آجاتی ہے۔ اس اسلوب کے متعدد فوائد ہیں۔

اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ معنی و مفہوم مبہم و واضح دو مختلف صورتوں میں سامنے آجاتا ہے دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مفہوم دل میں بیٹھ جاتا ہے کیوں کہ مشقت اور اشتیاق کے بعد حاصل ہونے والی چیز کی قدر زیادہ ہوتی ہے۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے لذت علم کی تکمیل ہوتی ہے۔

چوتھا فائدہ یہ ہے کہ اجمال کے بعد وہ شیٔ تفصیل سے سامنے آجاتی ہے جس سے ہر قسم کا ابہام ختم ہو جاتا ہے۔ (۱۷۴)

سورہ مومن اٹھایئے اور مندرجہ ذیل آیات کا مطالعہ کیجیے:

وَقَالَ الَّذِیْ آمَنَ یَا قَومِ اتَّبِعُونِ أَهْدِكُم سَبِیلَ الرَّشَادِ یَا قَومِ إِنَّمَا هٰذِهِ الحَیٰوةُ الدُّنیَا مَتَاعٌ و إِنَّ الآخِرَةَ هِیَ دَارُ القَرَارِ مَنْ عَمِلَ سَیِّئَةً فَلا یُجزیٰ إِلاَّ مِثلَهَا وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنثیٰ وَ هُوَ مُؤمِنٌ فَأُولٰئِكَ یَدْخُلُونَ الجَنَّةَ یُرزَقُونَ فِیهَا بِغَیرِ حِسَابٍ۔ وَ یٰقَومِ مَا لِیَ أَدعُوكُم إِلَی النَّجٰوةِ وَ تَدْعُونَنِیٓ إِلَی النَّارِ تَدعُونَنِی لِأَكفُرَ بِاللّٰهِ و أُشرِكَ بِهٖ مَا لَیسَ لِی بِهٖ عِلمٌ وَ أَنَا أَدعُوكُم إِلَی العَزِیزِ الغَفَّارِ ۔ (۳۸-۴۲)

(وہ شخص جو ایمان لایا تھا بولا، اے میری قوم کے لوگو، میری بات مانو، میں تمہیں صحیح

Marfat.com

راستہ بتاتا ہوں، اے قوم یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے ہمیشہ کی قیام کی جگہ تو آخرت ہی ہے۔ جو برائی کرے گا اس کو اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنی اس نے برائی کی ہو گی اور جو نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو، ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے جہاں ان کو بے حساب رزق دیا جائے گا۔ اے قوم آخر یہ کیا ماجرا ہے میں تمہیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم لوگ مجھے آگ کی طرف دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ سے کفر کروں اور اس کے ساتھ ان ہستیوں کو شریک ٹھیراؤں جنھیں میں نہیں جانتا اور میں تم کو خدائے عزیز و غفار کی دعوت دے رہا ہوں)

دیکھئے قوم فرعون کے مرد مومن نے کس حکمت و بلاغت کے ساتھ ان کی دکھتی رگ پکڑی ہے اسے معلوم تھا کہ دنیا طلبی اور حد سے بڑھی ہوئی مادیت زدگی اور آخرت کا انکار ہی وہ چیزیں ہیں جو ایمان کی راہ کے سنگ گراں ہیں چناں چہ اس نے پہلے سبیل الرشاد کی رہنمائی کا اعلان کر کے لوگوں کو تحیر میں ڈال دیا کہ سبیل الرشاد سے کیا مراد ہے۔ پھر دنیا پرستی سے بے نیازی اور یوم آخرت کا خوف پیدا کر کے گویا اس نے صحیح راستے کی وضاحت کر دی جس کی رہنمائی کا اعلان کیا تھا اور بڑی حکمت کے ساتھ انہیں سمجھایا کہ تم لوگ مجھے جہنم کی طرف بلانا چاہتے ہو جب کہ میں تمہاری نجات کی فکر کر رہا ہوں اور تمہیں عزیز و غفار مولیٰ کے دامن میں پناہ لینے کی دعوت دے رہا ہوں۔

سورہ احزاب کی مندرجہ ذیل آیات کا مطالعہ کیجیے:

وَ إِذْ تَقُولُ لِلَّذِیْ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ أَنْعَمْتَ عَلَیْهِ أَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ و تَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشٰه فَلَمَّا قَضٰى زَیْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا۔ (۳۷)

(اے نبی یاد کرو وہ موقع جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا کہ اپنی بیوی کو نہ چھوڑ اور اللہ سے ڈر، وہ بات تم اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھولنا چاہتا تھا تم لوگوں سے ڈر رہے تھے حالاں کہ وہ زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو، پھر جب زید اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس کا تم سے نکاح کر دیا)

یہاں **و تخفی فی نفسك ما الله مبدیه** میں ابہام تھا کہ آنحضرتؐ کے دل میں آخر کیا

Marfat.com

خیال تھا پھر آگے کی آیات میں اس کی وضاحت فرمادی گئی کہ تم کو حضرت زینب کی دلداری کے لیے انہیں اپنے نکاح میں لینا پڑتا لیکن تمہیں اندیشہ تھا کہ منافقین ایک بڑے فتنے کی راہ کھول دیں گے اور لوگوں میں پروپیگنڈہ کریں گے کہ آپ نے اپنے متبنیٰ کی بیوی سے نکاح کرلیا ہے تم اس فتنہ سے بچنا چاہتے تھے اس لیے تمہاری آرزو تھی کہ طلاق کی نوبت نہ آئے لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی تھا کہ یہ نوبت آئے اور تمہارے ہاتھوں جاہلیت کی اس غلط رسم کی اصلاح ہو اور تم کسی کی لعنت وملامت اور مخالفت کی پروانہ کرو بلکہ صرف اللہ سے ڈرو۔(۱۷۵)

سورہ صٰفّات میں دیکھیے جب اللہ نے یہ فرمایا:

فَٱسۡتَفۡتِهِمۡ أَلِرَبِّكَ ٱلۡبَنَاتُ وَ لَهُمُ ٱلۡبَنُونَ (۱۴۹)

(پھر ذرا ان لوگوں سے پوچھو کیا تمہارے رب کے لیے بیٹیاں ہوں اور ان کے لیے بیٹے ہوں)

تو مخاطب کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ بیٹیاں کس کو کہا جارہا ہے؟ وہ کون لوگ ہیں؟ چناں چہ اس کی صراحت آگے کی آیت میں ہو گئی:

أَمۡ خَلَقۡنَا ٱلۡمَلَٰٓئِكَةَ إِنَٰثًا وَّ هُمۡ شَٰهِدُونَ (۱۵۰)

(کیا واقعی ہم نے ملائکہ کو عورتیں ہی بنایا ہے اور یہ آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں)(۱۷۶)

اس آیت سے اس بات کی وضاحت ہو گئی کہ وہاں بیٹیوں سے مراد فرشتے تھے اس وضاحت نے تمام اشکالات کو رفع کر دیا۔

سورہ مومن کی اس آیت کو دیکھیے:

وَ إِنۡ يَّكُ كَٰذِبًا فَعَلَيۡهِ كِذۡبُهُۥ وَ إِنۡ يَّكُ صَادِقًا يُصِبۡكُمۡ بَعۡضَ ٱلَّذِى يَعِدُكُمۡ(۲۸)

(اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا وبال اس کے سر آئے گا اور اگر وہ سچا ہے تو وہ چیز جس کا تم کو وعید سنا رہا ہے اس کا کوئی حصہ تم پر نازل ہو کر رہے گا)

یہاں **بعض الذی یعدکم** مبہم ہے اس کو آگے یوں کھول کر رکھ دیا:

وَ قَالَ ٱلَّذِى ءَامَنَ يَٰقَوۡمِ إِنِّىٓ أَخَافُ عَلَيۡكُم مِّثۡلَ يَوۡمِ ٱلۡأَحۡزَابِ مِثۡلَ دَأۡبِ قَوۡمِ نُوحٍ وَ عَادٍ وَ ثَمُودَ وَٱلَّذِينَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ وَ مَا ٱللَّهُ يُرِيدُ ظُلۡمًا لِّلۡعِبَادِ(۳۰-۳۱)

(وہ شخص جو ایمان لایا تھا اس نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! مجھے خوف ہے کہ کہیں تم پر

Marfat.com

وہ دن نہ آجائے جو اس سے پہلے بہت سے جتھوں پر آچکا ہے جیسا دن قوم نوحؑ، عادؑ اور ثمود اور ان کے بعد والی قوموں پر آیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا)

اس آیت سے صراحت ہو گئی کہ وہاں عذاب کی دھمکی دی گئی تھی سورہ زخرف میں اس اسلوب کی جلوہ گری یوں ہوئی:

أَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَ أَصْفٰكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَ إِذَا بُشِّرَ أَحَدُكُم بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلاً ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَ هُوَ كَظِيْمٌ أَوَ مَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَ هُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ وَ جَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ إِنَاثًا أَشَهِدُوا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ (۱۶-۱۹)

(کیا اللہ نے اپنی مخلوق میں سے اپنے لیے بیٹیاں انتخاب کیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا اور حال یہ ہے کہ جس اولاد کو یہ لوگ اس خدائے رحمٰن کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کی ولادت کا مژدہ جب خود ان میں سے کسی کو دیا جاتا ہے تو اس کے منہ پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے کہ کیا وہ اولاد پیدا ہوئی ہے جو زیوروں میں پالی جاتی ہے اور بحث و حجت میں اپنا مدعا پوری طرح واضح نہیں کر سکتی (۱۷۷) انھوں نے فرشتوں کو جو خدائے رحمان کے خاص بندے ہیں عورتیں قرار دے لیا کیا ان کے جسم کی ساخت انھوں نے دیکھی ہے؟ ان کی گواہی لکھ لی جائے گی اور انہیں اس کی جواب دہی کرنی ہو گی)

ان آیات میں (۱۶-۱۸) ابہام تھا۔ بنٰتٌ کا لفظ تحیر اور اشتباق میں مبتلا کر رہا تھا جسے آیت (۱۹) نے دور کر دیا کہ یہاں بنٰتٌ سے مراد فرشتے ہیں۔

Marfat.com

۱۹۔ تنکیر کے کچھ خاص اصول

تنکیر و تعریف کے عام اصولوں کو نحو کی کتابوں میں دیکھنا چاہیے یہاں کچھ خاص اسالیب پر جنھیں قرآن نے استعمال کیا ہے غور کرنا مطلوب ہے۔

۱۔ کبھی کبھی نکرہ سے کوئی خاص آدمی یا شئی مراد لی جاتی ہے جو سیاق کلام سے سمجھ میں آتی ہے مثال کے طور پر سورہ انعام کی مندرجہ ذیل آیات کو دیکھیے:

وَ وَهبْنَا لَهٗ إسحٰقَ وَ يَعْقُوبَ كلاً هَدَيْنَا (۸۴)

(پھر ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب جیسی اولاد عطا کی اور ہر ایک کو راہ راست دکھائی)

یہاں کلاً گرچہ نکرہ ہے لیکن یہاں عام افراد مراد نہیں ہیں بلکہ اسحٰق اور یعقوب ہی مراد ہیں۔

آگے فرمایا:

و ذَكرِيَّا و يَحيٰ وَعِيسٰى و إلياسَ كُلٌّ مِنَ الصَّالِحِينَ (۸۵)

(اور ذکریا اور یحیٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو راہ یاب کیا ہر ایک ان میں سے صالح تھا)

اس آیت میں کلٌ کا لفظ گرچہ عام ہے لیکن مراد ذکریاؑ، یحیٰؑ، عیسیٰؑ اور الیاسؑ ہیں۔ آگے مزید فرمایا:

و إسمٰعِيلَ واليَسَعَ و يُونُسَ و لُوطًا و كُلاًّ فَضَّلنَا عَلَى العَالِمِينَ (۸۶)

(اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو راستہ دکھایا اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام دنیا والوں پر فضیلت عطا کی)

یہاں کُلاً سے مراد مذکورہ انبیاء ہی ہیں۔

سورہ مریم میں فرمایا:

وَ وهَبْنَا لَهٗ إسحٰقَ و يَعْقُوبَ و كُلاًّ جعَلنَا نبيًّا (۴۹)

(اور ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب دیئے اور ہر ایک کو نبی بنایا)

یہاں بھی کُلاً سے مراد یعقوب و اسحاق علیہما السلام ہیں۔

Marfat.com

سورہ انبیاء میں فرمایا:

وَ وهَبْنَا له إسْحَاقَ و يَعْقُوبَ نَافِلةً و كُلاً جعَلْنَا صَالِحِينَ (۷۲)

(اور ہم نے اسے اسحاق کو عطا کیا اور یعقوب اس پر مزید اور ہر ایک کو صالح بنایا)

یہاں بھی کُلاً سے مراد اسحاقؑ و یعقوبؑ ہیں۔

آگے فرمایا:

وَ دَاوُدَ و سليمٰنَ إِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الحَرْثِ إذ نَفَشَتْ فيهِ غَنَمُ القَوْمِ و كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِيْنَ فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ و كُلاً أتَيْنَا حُكْمًا وَّ علمًا۔(۷۹)

(اور اسی نعمت سے ہم نے داؤد اور سلیمان کو سر فراز کیا یاد کرو وہ موقع جب وہ دونوں ایک کھیت کے مقدمے میں فیصلہ کر رہے تھے جس میں رات کے وقت دوسرے لوگوں کی بکریاں پھیل گئی تھیں اور ہم ان کی عدالت خود دیکھ رہے تھے اس وقت ہم نے صحیح فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا حالاں کہ حکم اور علم ہم نے دونوں کو عطا کیا تھا)

یہاں بھی کُلاً سے مراد داؤدؑ اور سلیمانؑ ہیں۔

آگے مزید فرمایا:

وَ إِسْمَاعِيلَ وَ إِدْرِيسَ وَ ذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصَّابِرِيْنَ (۸۵)

(اور یہی نعمت اسماعیل، ادریس اور ذوالکفل کو دی کہ یہ سب صابر لوگ تھے)

یہاں بھی کُلٌّ سے مراد ماسبق انبیاء ہیں۔

۲۔ کبھی کبھی نکرہ تعمیم کے لیے بھی آتا ہے مثال کے طور پر سورہ حشر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَآ ايُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (۱۸)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے)

یہاں نفسٌ سے مراد کُلُّ نَفْسٍ ہے یعنی ہر ایک جان سوچ لے کہ کل کے لیے اس نے کیا کیا ہے۔

اسی طرح سورہ منافقون میں ہے:

Marfat.com

وَ لَن يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفسًا إذا جَاءَ أجلُها وَاللّٰهُ خبِيرٌ بِمَا تَعمَلُونَ (۱۱)

(جب کسی کی مہلت عمل پوری ہونے کا وقت آجاتا ہے تو اللہ کسی شخص کو مزید مہلت ہرگز نہیں دیتا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے)

یہاں بھی نفساً سے مراد کل نفس ہے یعنی ہر وہ شخص جس کی مدت حیات ختم ہو چکی ہو اللہ اسے ذرا بھی مہلت نہیں دے گا۔

سورہ بقرہ میں یہود کا موازنہ مشرکین عرب سے یوں کیا جاتا ہے:

وَ لَتَجِدَنَّهُم أحرَصَ النَّاسِ عَلٰى حيٰوةٍ وَّ مِنَ الَّذِيْنَ أشرَكُوا يَوَدّ أحَدَهُمُ لَو يُعَمَّرُ الفَ سَنَةٍ وَّ مَا هُوَ بِمُزَحزِحِهٖ مِنَ العَذَابِ أنْ يُّعَمَّرَ واللّٰهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعمَلُونَ (۹۶)

(اور تم ان کو زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے ان لوگوں سے بھی زیادہ جنھوں نے شرک کیا ہے ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش اس کو ہزار سال عمر ملے حالاں کہ یہ عمر بھی ان کو ملے تو بھی وہ اپنے آپ کو خدا کے عذاب سے بچانے والے نہیں بن سکتے اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں)

یہاں جس زندگی کا تذکرہ ہے وہ بالکل مطلق ہے وہ زندگی کے حریص ہیں قطع نظر اس سے کہ وہ زندگی بلند ہے یا پست انہیں تو بس زندگی کی محبت ہی سب کچھ دکھائی دیتی ہے یہ لوگ فکری و اخلاقی حیثیت سے نہایت پست سطح پر ہیں۔ زندگی اگر مثالی اور اعلیٰ اقدار کی حامل ہو تو مرغوب ہے لیکن پست زندگی، زیب و زینت اور لہو و لعب کی زندگی قابل نفریں ہے اس لیے یہودیوں پر لعنت و ملامت کی گئی ہے۔

۳۔ بسا اوقات نکرہ تعظیم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَ جَاءَ السَّحَرَةُ فِرعَونَ قَالُوا إنَّ لَنَا لَأجرًا إنْ كُنَّا نَحنُ الغَالِبِيْنَ (اعراف: ۱۱۳)

(جادوگر فرعون کے پاس حاضر ہوئے بولے بڑا صلہ ملے گا ہمیں اگر ہم ہی غالب رہے)

یہاں إنَّ لَنَا لَأجرًا دراصل لأجراً عظيمًا کے معنی میں ہے یعنی ساحروں نے سامنے آتے ہی اپنے اس ارمان اور توقع کا اظہار کیا کہ اگر ہم نے بازی جیتی تو سرکار سے بڑا انعام ملے گا۔

اسی طرح قرآن میں جہاں کہیں ذکر کا لفظ نکرہ استعمال ہوا ہے تعظیم و تفخیم کے لیے

Marfat.com

استعمال ہوا ہے مثال کے طور پر دیکھیے:

أَوَ عَجِبتُم أَنْ جَآءَ كُم ذِكرٌ مِّن رَّبِّكُم عَلىٰ رَجُلٍ مِّنكُم لِيُنذِرَكُم وَ لِتَتَّقُوا (اعراف : ۶۳)

(اور کیا تمہیں یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی یاد دہانی تمہیں میں سے ایک شخص کے ذریعہ سے آئی تاکہ وہ تمہیں باخبر کرے اور تاکہ تم ڈرو)

وَمَا تَسأَلُهُم عَلَيهِ مِنْ أَجرٍ إِنْ هُوَ إِلاَّ ذِكرٌ لِّلعٰلَمِينَ (یوسف: ۱۰۴)

(اور تم اس پر ان سے کوئی معاوضہ تو نہیں طلب کر رہے ہو یہ تو بس دنیا والوں کے لیے یاد دہانی ہے)

چناں چہ کہیں ذکر کا امتیاز یہ بیان ہوا ہے کہ وہ وحی الٰہی ہے کہیں اسے سارے عالم کی یاد دہانی کہا گیا ہے اور کہیں اسے بابرکت اور مقدس قرار دیا گیا ہے اور قرآن پر نظر رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ اس ذکر سے مراد خود یہ قرآن ہے۔

۴۔ کہیں نکرہ تقلیل کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کہتا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ المُؤمِنِينَ وَ المُؤمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجرِىْ مِنْ تَحتِهَا الأَنهَارُ خَالِدِيْنَ فِيهَا وَ مَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِىْ جَنَّاتِ عَدْنٍ وَ رِضوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ أَكبرُ ذَلِكَ هُوَ الفَوزُ العَظِيمُ (توبہ: ۷۲)

(مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ایسے باغوں کے لیے ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ مکانوں کے لیے ابد کے باغوں میں اور اللہ کی تھوڑی سی خوشنودی بہت بڑی چیز ہے یہی بڑی کامیابی ہے)

یہاں رضوان نکرہ استعمال ہوا ہے جو تقلیل کے مفہوم پر مشتمل ہے یعنی مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ابدی باغات، جاری نہروں اور پاکیزہ مکانوں کا تو وعدہ ہے ہی لیکن یہ سارے صلے خدا کی خوشنودی کے مقابلے میں ہیچ ہیں چاہے وہ بظاہر تھوڑی سی حاصل ہو آدمی کی اصل کامیابی یہ ہے کہ اس کا مالک اس سے خوش ہو جائے۔

ایک دوسرے مقام پر قرآن کہتا ہے:

مَا نَدرِىْ مَا السَّاعَةُ إِنْ نَظنُّ إِلاَّ ظَنًا وَ مَا نَحنُ بِمُستَيقِنِينَ (جاثیہ:۳۲)

Marfat.com

(ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا ہے۔ بس ایک گمان ہے جو ہم کرتے ہیں اور ہم اس کا یقین کرنے والے نہیں ہیں)

یہاں مطلب یہ ہے کہ قیامت کے بارے میں بس انہیں ایک معمولی سا گمان ہے یقین ہرگز نہیں ہے۔

یہی نکرہ بسا اوقات تحقیر و تذلیل کا مفہوم بھی دے دیتا ہے جیسے ذیل کی آیات دیکھیے:

أَكَفَرْتَ بِالَّذِىْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ سَوّاكَ رَجُلاً (کھف:۳۷)

(کیا تم نے اس ذات کا انکار کیا جس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر پانی کی ایک بوند سے، پھر تم کو ایک مرد بنا کر کھڑا کیا)

قُتِلَ الإنسانُ مَا أَكفَرَهٗ مِنْ أىّ شَيءٍ خَلَقَهٗ مِنْ نُطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ (عبس:۱۷-۱۹)

(برا ہو آدمی کا، یہ کتنا ناشکرا ہے! اسے کس چیز سے پیدا کیا؟ پانی کی ایک بوند سے اس کو پیدا کیا پھر اس کے لیے ایک اندازہ ٹھیرایا)

یہاں نکرہ کا استعمال تحقیر و تذلیل کے لیے ہے فرمایا کہ نجس پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوئی مخلوق کو اپنی برتری و پاک دامنی کا غرّہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے آپ کو پیدائشی حق دار جنت سمجھے۔

ان مشرکین کے اس زعم پر قرآن نے ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں ضرب لگائی ہے:

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا قِبَلَكَ مُهطِعِيْنَ عَنِ الْيَمِيْنِ وَ عَنِ الشَّمالِ عِزِيْنَ أَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِىءٍ مِّنْهُم أَنْ يَّدْخُلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ كَلاّ إنّا خَلَقْنَاهُم مِمّا يَعْلَمُونَ (معارج : ۳۶-۳۹)

"پس ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ تمہارے اوپر پلے پڑ رہے ہیں، داہنے بائیں سے ٹولیاں بنا بنا کر، کیا ان میں سے ہر شخص یہ توقع لیے بیٹھا ہے کہ وہ نعمت کے باغ میں داخل کر دیا جائے گا؟ ہرگز نہیں ہم نے ان کو پیدا کیا ہے اس چیز سے جس کو وہ جانتے ہیں۔

۵۔ نکرہ بسا اوقات تشویق و ترغیب کے لیے بھی استعمال ہوا ہے مثال کے طور پر سورہ صف میں ارشاد ہوتا ہے:

يَا ايُّهَا الَّذِيْنَ آمنُوا هَلْ أدُلُّكُم عَلٰى تِجَارَةٍ تُنجِيْكُم مِنْ عَذَابٍ أَلِيْمٍ (۱۰)

Marfat.com

(اے ایمان والو کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں ایک دردناک عذاب سے نجات بخشے)

یہاں لفظ تجارت کا نکرہ استعمال ہونا شوق ورغبت دلانے کے لیے ہے۔

لیکن یہ پہلو ہمیشہ نگاہ میں رہنا چاہیے کہ یہ تمام فوائد اور استعمالات موقع و محل کے لحاظ سے حاصل ہوتے ہیں سیاق کلام ہی سے ان فوائد کی طرف ذہن منتقل ہو سکتا ہے اس سلسلے میں کوئی قاعدہ کلیہ نہیں بنایا جاسکتا۔

Marfat.com

خلاصہ

حضرات انبیاء کرام کی زبان نہایت فصیح، شستہ، شیریں اور موثر ہوتی تھی۔ وہ دعوت کے لیے ایسا اسلوب اور ایسی زبان استعمال کرتے تھے جو دلوں میں اتر جاتی تھی اور بدترین مخالف کو بھی چت کر دیتی تھی۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے بڑا معجزہ قرآن دیا گیا تھا جو ادب کا سب سے اعلیٰ شاہکار اور فصاحت و بلاغت کا بے بدل نمونہ تھا، جس نے عرب کے فصحاء و بلغاء کو اس جیسی ایک ہی سورہ لانے کی دعوت دی لیکن وہ اس دعوت اور چیلنج کو قبول نہ کر سکے اور وقت کے ملک الشعراء اور فصیح دوراں بھی اس کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئے۔

لیکن اس کے ساتھ ایک معجزہ آپ کو اور عطا کیا گیا تھا اور وہ جوامع الکلم کا تھا، چھوٹے چھوٹے گٹھے ہوئے جملے، شیریں و موثر لب و لہجہ، حکمت و نصیحت سے بھرپور کلمات، ایک ایک لفظ موتیوں سے ٹنکا ہوا۔

دراصل قرآن پاک کا یہ اعجاز اس کی آیات کے باہمی ربط و نظام میں پوشیدہ ہے کتاب حکیم کی حکیمانہ نظم و ترتیب ہی ان سارے کارناموں کی بنیاد ہے۔ اس بے مثال نظم و ترتیب سے وہ لازوال اسلوب ادب وجود میں آیا ہے جو دنیا کی کسی اور کتاب میں نہیں پایا جاتا۔

لیکن ضروری ہے کہ قرآن کا یہ اسلوب نحو و بلاغت کے قواعد و ضوابط سے نہ پرکھا جائے بلکہ قرآن کے اسلوب اور استعمالات کو سامنے رکھ کر فن نحو و بلاغت کو از سر نو تشکیل دیا جائے۔

اس وقت آپ دیکھیں گے کہ قرآن کا اسلوب تکرار، تخلیص، تخاطب، عود الی البدء، تضمین، حذف، تنکیر و تعریف، تکمیل و تقابل، تجنیس و مشاکلت، قسم و تصریف اور دوسرے تمام اسالیب ادب اور بلاغت کے اس مقام پر ہیں جہاں تک انسانی ذہن نہیں پہنچ سکتا۔ کمال یہ ہے کہ یہ تمام اسالیب جاہلی کلام میں مستعمل ہیں لیکن قرآن کا ادب نرالا اور انوکھا ہے۔ اور اس وقت آپ کو یہ احساس ہو گا کہ قرآن کا یہ چیلنج کتنا وزنی ہے:

Marfat.com

"کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لا سکیں گے چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔" (بنی اسرائیل:۸۸)

عود الی البدء وہ اسلوب ہے جس میں کلام کا آغاز جس چیز سے ہوا ہو اسی پر اس کا خاتمہ بھی ہوتا ہے تاکہ اس کی معنویت وافادیت دلوں پر نقش ہو جائے۔

مشاکلت میں بعض الفاظ محض مجانست اور صوتی ہم آہنگی کی وجہ سے استعمال ہو جاتے ہیں اور ان کا مفہوم لغت کے اعتبار سے نہیں بلکہ سیاق کلام اور موقع و محل سے متعین ہوتا ہے۔

نہی کے ساتھ قید کا فائدہ محض صورت حال کے گھنونے پن کا اظہار ہوتا ہے۔ قید اس لیے بڑھادی جاتی ہے تاکہ وہ صورت واقعہ سامنے آجائے جو اس کے ارتکاب میں مضمر ہے۔

اسلوب تصریف میں الٹ پلٹ کر اور ہیر پھیر کر آیات بیان کی جاتی ہیں اور ہر جگہ اس کے اطراف وجوانب اور لواحق و تضمنات بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔

تخلیص کو اردو شاعری کی اصطلاح میں گریز کہا جاسکتا ہے جسے امام ابن قیم جوزی نے انتقال من فن الی فن کا اور سیوطی نے حسن التخلص کا نام دیا ہے یعنی بات میں سے بات پیدا ہو جاتی ہے اور چلتے چلتے مناسب حال گفتگو بھی ہو جاتی ہے۔

تکرار محض سے قرآن پاک خالی ہے جہاں کہیں الفاظ، جملوں یا معانی کی تکرار نظر آتی ہے وہاں کوئی نئی بات کوئی لطیف حکمت اور جدید نکتہ سمجھانا ہوتا ہے بالکل یہی بات قصص وواقعات کے تکرار میں بھی ہے۔

قرآن پاک میں استشہاد و استدلال کے لیے قسمیں کھائی گئی ہیں۔ قرآن نے توحید و رسالت اور آخرت پر گفتگو کرنے کے لیے اور ان مابعد الطبیعی حقائق کو ذہن نشین کرانے کے لیے جن وسائل واسالیب کا سہارا لیا ہے ان میں ایک موثر اسلوب قسم ہے جہاں زور اور تاکید کے ساتھ بطور دلیل اپنی بات رکھ دی جاتی ہے اور منکر حق کے لیے غور و فکر کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔

قرآن کبھی براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتا ہے اور کبھی نبی کے واسطے سے قوم کو، کبھی واحد کے صیغے میں اس کا مخاطب ہوتا ہے اور کبھی جمع کے صیغے میں پھر جہت خطاب کی تبدیلی اور اس کے عموم و خصوص سے بڑی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اس لیے ان تمام امور کا ادراک

Marfat.com

ضروری ہے۔

کبھی عطف کے ساتھ یا بغیر عطف کے دو الفاظ یا متصل جملوں میں ربط پیدا ہو جاتا ہے جس سے گوناگوں مفاہیم و معانی پیدا ہو جاتے ہیں اس اسلوب کو قران کہا جاتا ہے۔

عرب الحرّ یکفیه الإشارة کے عادی تھے اور ان کے نزدیک بہترین کلام وہ تھا جو ما قلّ و مادلّ ہو اسی لیے کلام کے ان غیر ضروری اجزاء کو نکال دیتے تھے جس کے بغیر بھی بات سمجھ میں آجائے اسی کو خذف کہتے ہیں۔

کسی نامعلوم چیز کے بارے میں سوال کرنے کو استفہام کہا جاتا ہے لیکن مثبت و منفی دونوں طریقوں میں قرآن نے متعدد فوائد اور حکمتوں کو سامنے رکھ کر اس اسلوب کو استعمال کیا ہے۔

یہی حال نفی کا بھی ہے اس کے استعمال کی متعدد شکلیں قرآن نے اختیار کی ہیں جو جاہلی کلام میں رائج تھیں۔

حال کی دو مختلف و منفرد شکلوں کا اظہار کیا گیا ہے جو بلاغت کی کتابوں میں موجود نہیں لیکن کلام جاہلی اور قرآن میں اس کی متعدد نظیریں ملتی ہیں۔

وصف کی بھی قرآن نے متعدد صورتیں استعمال کی ہیں اور ان کے ہمہ گیر فوائد حاصل کیے ہیں

بسا اوقات قرآن کوئی لفظ یا جملہ یا چند جملے ایسے بھی استعمال کر جاتا ہے جن کے بغیر بھی گفتگو مکمل ہو سکتی تھی لیکن انہیں کسی مناسب حال اور مقتضائے موقع فائدہ کے پیش نظر درمیان کلام لے آیا گیا یہی اسلوب اعتراض کہلاتا ہے۔

ایک اور اسلوب تکمیل کا ہے یعنی بات محتاط اور معتدل انداز میں کہی جائے لیکن اس سے گفتگو مکمل ہوتی نظر نہ آرہی ہو یا کسی التباس کا اندیشہ ہو یا اتنی گفتگو سے مخاطب کسی غلط فہمی میں اور شک و شبہ میں مبتلا ہو سکتا ہو تو اس کی وضاحت کر کے بات مکمل کر دی جائے اس اسلوب کو ارباب بلاغت نے احتراس کا نام دیا ہے قرآن کے بے مثل ادب نے اسے بھی شرف قبولیت بخشی ہے۔

عطف بالواؤ کا عام فائدہ جمع و ترتیب ہے لیکن اس عام فائدے سے ہٹ کر قرآن نے اس سے تبیین و توضیح، نتائج پر گفتگو کمال اتصال، علت و سبب کے اظہار وغیرہ کے فوائد بھی حاصل کیے ہیں جو جاہلی کلام میں عام تھے۔

قرآن نے کہیں کہیں ابہام کے بعد تفصیل و توضیح کا اسلوب بھی استعمال کیا ہے اس سے

Marfat.com

متعدد فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ معنی ومفہوم واضح ہو جاتا ہے، لذت علم کی تکمیل ہو جاتی ہے، اشتیاق کے بعد حاصل ہونے والے علم سے ذہن آسودہ ہو جاتا ہے اجمال کے بعد وہی شئ تفصیل سے سامنے آجاتی ہے اور ہر قسم کا ابہام والتباس ختم ہو جاتا ہے۔

تنکیر کے اسلوب میں بھی عام استعمال سے قطع نظر قرآن نے متعدد حکمتوں اور فائدوں کو اس کے استعمال میں ملحوظ رکھا ہے۔

یہاں قرآن کے ادبی اسالیب میں سے صرف انیس اسلوبوں پر گفتگو کی گئی ہے گویا بحر ذخار سے چند قطرے اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں پورا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آسکتا ہے لیکن یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ ع ہر قطرہ دریا میں ہے دریا کی گہرائی۔

قرآن مبین کا ادب معجزہ، اس کی بلاغت مافوق الفطری، اس کا اسلوب الہامی اس کی فصاحت منزل من اللہ ہے اس لیے اس کی حکمتوں اور اسرار کو انسانی کوزے میں کیوں کر سمیٹا جاسکتا ہے۔ بس یہ تھوڑے سے رشحات ہیں جو اس الہامی بارش کی حکمتوں اور فوائد و ثمرات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ قرآن کا حال یہ ہے کہ جس قدر اس کی ادبی نزاکتوں پر گفتگو کی جائے وہ انسانی ہاتھوں کی رسائی سے مزید بلند ہو جاتی ہیں، جتنی زیادہ اس کی فصاحت و بلاغت پر روشنی ڈالی جائے ہماری بے بسی اور عاجزی و درماندگی کا احساس دو چند ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک ماضی میں معجزہ تھا حال میں معجزہ ہے اور مستقبل میں قیامت تک کے لیے معجزہ رہے گا اور یہ اعجاز اس کے ادب، اس کی بلاغت اس کے نظم و ترتیب، اس کے معانی و مطالب اس کی نغمگی و صوتی ہم آہنگی، اس کے جمال و جلال، اس کی پیشین گوئیوں اور غیبی انکشافات اور اس کی سائنسی ایجادات و اختراعات کی طرف اشاروں غرضیکہ ہر جہت سے ہر پہلو سے اور ہر میدان میں نمایاں ہے۔

Marfat.com

تعلیقات وحواشی

(۱) حمیدالدین فراہی، القائد إلی عیون العقائد، اعظم گڑھ، ۱۳۹۵ھ، ص: ۱۷۷-۱۸۰

(۲) قرآن، یٰسٓ: ۶۹ "ہم نے اس کو شعر نہیں سکھایا ہے نہ یہ اس کے کرنے کا کام ہے نیز شعراء ۲۲۴-۲۲۵ اور طور: ۲۹-۳۲

(۳) قرآن، مدثر: ۲۴ "آخر کار بولا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو جو پہلے سے چلا آرہا ہے۔

(۴) سید محمد یوسف: قرآن کا ادبی اسلوب: سیارہ ڈائجسٹ لاہور قرآن نمبر جلد دوم

(۵) سید قطب شہید، التصویر الفنی فی القرآن، الطبعۃ الثالثہ، مصر، ص: ۲۳

(۶) عبدالکریم الخطیب، اعجاز القرآن۔ دار الفکر العربی ۱۳۷۳ھ، ص: ۱۲۱

(۷) مجدالدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی، بصائر ذوی التمیز فی لطائف الکتاب العزیز الجزء الاول، ص: ۶۸

(۸) نعیم الحمصی، تاریخ فکرۃ اعجاز القرآن، المجمع العلمی العربی دمشق ۱۹۵۵ء، ص: ۵۴-۵۶

(۹) محمد عبدالعظیم الزرقانی، مناہل العرفان فی علوم القرآن الجزء الثانی ۱۹۵۳ء، ص: ۲۰۵-۲۲۰ نیز دیکھیے محمد علی الصابونی، التبیان فی علوم القرآن ۱۹۷۰ء، ص: ۱۰۷-۱۰۸

(۱۰) یہ بات حضورؐ نے اس وقت کہی تھی جب وفد ثقیف نے آپ سے نمازوں کی معافی کی درخواست کی تھی۔ محمد غزالی، فقہ السیرۃ ۱۴۰۰ھ، ص: ۶۲۶ بحوالہ ابوداؤد ۲/ ۲۴۲، ابن ہشام ۲/ ۳۲۵-۳۲۶

(۱۱) قرآن، حجرات: ۱۱ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں"

(۱۲) لسان العرب، ۵/ ۱۸۳

(۱۳) ابو ہلال عسکری، الفروق، بحوالہ سید محمد مرتضی زبیدی، تاج العروس، ۳/ ۵۴۸

(۱۴) سنن ابو داؤد باب المکر فی الحرب، ص: ۳۵۳، بخاری کتاب الجہاد: ۱۰۳، المغازی: ۷۹، مسلم توبہ: ۵۴، دارمی، سیر: ۱۴، مسند احمد بن حنبل: ۳/ ۴۵۶-۴۵۷

(۱۵) شوکانی، فتح القدیر: ۱/ ۳۴۴، قرآن میں یہ لفظ اور دوسری جگہوں پر بھی اللہ کے لیے استعمال ہوا ہے جیسے انفال: ۳۰، اعراف: ۹۹، یونس: ۲۱، رعد: ۴۲، ابراہیم: ۴۶، نحل: ۵۰ وغیرہ

(۱۶) اسی مفہوم کو سورہ مائدہ کی آیت ۴۴ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: "ہم نے تورات اتاری جس میں ہدایت اور روشنی ہے اسی کے مطابق یہود کے معاملات کے فیصلہ کرتے رہے وہ انبیاء جنھوں نے خدا کی فرمانبرداری کی اور مربیوں اور علماء نے بھی اسی کے مطابق فیصلے کیے کیوں کہ وہ کتاب الٰہی کے امین بنائے گئے تھے اور اس کے گواہ ٹھیرائے گئے تھے تو تم لوگوں سے نہ ڈرو صرف مجھی سے ڈرو اور میری آیات کو حقیر قیمت کے عوض نہ بیچو"

Marfat.com

(۱۷) قرآن پاک کے اسی اسلوب کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض حضرات نے یہ ترجمہ کر دیا ہے کہ دو گنا تگنا سود نہ لو یعنی جو سود دو گنا تگنا نہ ہو اسے لینا ان کے نزدیک جائز ہے ان کے نزدیک فی نفسہٖ ربوا کی ممانعت نہیں ہے بلکہ دو چند سہ چند ربوا لینے کی ممانعت ہے۔ پھر انھوں نے کمرشیل انٹرسٹ کو اسی استدلال کی بنیاد پر حلال اور جائز قرار دے دیا حالاں کہ یہ استدلال بالکل غلط اور اسلوب قرآن سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان میں اس طرز فکر کی ابتداء سر سید احمد مرحوم سے ہوئی (تفسیر قرآن سورہ بقرہ آیت ربوا) اور ان کی پیروی ان کے مکتب خیال کے لوگوں نے کی مثلاً نذیر احمد (الحقوق والفرائض، ۲: ۴۱۸ تا ۴۴۴) سید طفیل احمد منگلوری (مسئلہ سود اور مسلمانوں کا مستقبل) اور اقبال سہیل (حقیقۃ الربا) وغیرہ بعض مصری علماء مثلاً شیخ محمد عبدہ (رشید رضا: المنار ۳: ۱۱۶) توفیق آفندی، شیخ اسماعیل خلیل اور ترکی کے بعض تجدد پسند حضرات نے اس طرح کے خیالات ظاہر کیے۔ اس مسئلہ کی دینی و شرعی حیثیت دیکھنے کے لیے پڑھیے: فضل الرحمٰن، تجارتی سود تاریخی و فقہی نقطہ نظر سے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۷ء

(۱۸) نور: ۳۲ "تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں انکے نکاح کر دو"۔

(۱۹) روایات میں آتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں باقاعدہ چکلے قائم تھے جہاں قحبہ گری کا کام بڑے زور و شور سے ہوتا تھا۔ وہ لوگ اپنی لونڈیوں سے پیشہ کراتے تھے اور ان کی آمدنی سے فائدہ اٹھاتے تھے ان میں سے بعض دور اسلام میں بھی خفیہ طور سے یہ کاروبار چلا رہے تھے چناں چہ تاریخوں میں یہ ذکر موجود ہے کہ مشہور منافق عبداللہ بن ابی نے ایک چکلہ قائم کر رکھا تھا۔ تفسیر ابن کثیر: ۳/ ۲۸۹-۲۸۸

(۲۰) بنی اسرائیل: ۳۱ "اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی"۔

(۲۱) حمید الدین فراہی، مقدمہ تفسیر نظام القرآن، ص: ۴۸-۴۹

(۲۲) سورہ بقرہ کی مندرجہ ذیل آیت اس باب میں نہایت جامع ہے فرمایا: بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت، رات اور دن کی گردش اور ان کشتیوں میں جو سمندر میں لوگوں کے نفع کی چیزیں لے کر چلتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا پس اس سے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کر دیا اور اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے اور ہواؤں کی گردش میں اور بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان مسخر ہیں ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لینے والے ہیں (بقرہ: ۱۶۴)

(۲۳) نیز دیکھیے سورہ ذاریات: ۶-۱۰ ہواؤں کے تصرفات کی شہادت گوناگوں پہلوؤں سے دیکھنا ہو تو ملاحظہ کیجیے: (۱) حمید الدین فراہی، تفسیر سورہ ذاریات، (۲) امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن جلد ششم ص: ۵۸۶-۵۸۹ نیز جلد ہشتم، ص: ۱۳۱-۱۳۲

(۲۴) روم: ۳۰ فطرت الله التی فطر الناس علیها لا تبدیل لخلق الله ذٰلك الدین القیم ولكن اكثر الناس لا یعلمون یعنی "قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی یہی بالکل راست اور درست دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔"

(۲۵) نمل: ۶-۳۶، انبیاء: ۲۵، بینۃ: ۵، یوسف: ۳۹-۴۰، مائدہ: ۷۲، انعام: ۷۴-۸۱، ابراہیم: ۳۵-۳۶

(۲۶) انعام: ۴۰-۴۱، یونس: ۲۲-۲۳، روم: ۳۲-۳۳، زمر: ۸

(۲۷) بقرہ: ۲۱-۲۲، روم: ۲۰-۲۷، یٰسین: ۳۶-۴۴، حدید: ۴-۶، انعام: ۹۵-۹۸، مومنون: ۹۰

Marfat.com

(۲۸) نمل:۶۰-۶۴، فرقان:۱-۳، نحل:۶۵-۷۳ (۲۹) سیوطی،الاتقان، ص:۱۰۹

(۳۰) سید ابوالاعلی مودودی، مقدمہ تفہیم القرآن۔یہی بات کسی قدر فرق کے ساتھ مصطفیٰ صادق رافعی نے بھی کہی ہے دیکھیے تفصیل کے لیے:اعجاز القرآن والبلاغة النبوية ۱۹۶۹ء، ص:۲۱۹-۲۲۰

(۳۱) دی نیوانسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کا مصنف لکھتا ہے "....اس طرح قرآن اکثر یہ تاثر دیتا ہے کہ وہ کسی قدر الل ٹپ انداز میں مرتب کیا گیا ہے By a rather haphazard method of composition اور اس احساس کو اس حقیقت سے مزید تقویت ملتی ہے کہ مختلف محبوب اور دل نشین جملے جیسے ولکن اللہ غفور رحیم، ان اللہ علیم حکیم، ولکن اکثر الناس لا یعلمون وغیرہ سیاق وسباق سے بہت کم تعلق رکھتے ہیں یا بالکل ہی متعلق نہیں ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں محض صوتی نغمگی کے لیے مربوط کر دیا گیا ہے"(جلد:۱۵، ۱۹۷۷ء)

اسلام سے متعلق اس طرح کی غلطیوں سے یہ انسائیکلوپیڈیا پر ہے خاص طور سے قرآن پر اس کا جو آرٹیکل ہے وہ جابجانہ صرف اس کے تعصب بلکہ اس کی جہالت کا بھی مظہر ہے۔

(۳۲) اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن محض ایک سطحی کتاب ہے جس کے اندر کوئی دقائق وغوامض نہیں۔اس علیم وخبیر کے کلام کی نسبت ایسا گمان کیوں کر کیا جاسکتا ہے۔کیا یہ فرض کر لیا جائے کہ جب اللہ بندوں سے کلام کرتا ہے تو معاذاللہ اپنے غیر متناہی علوم سے کورا ہو جاتا ہے اس کے کلام میں وہ گہرے حقائق اور باریکیاں ہوں گی جن کا کسی دوسرے کلام میں تلاش کرنا بے کار ہے اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ لا تنقضی عجائبه (قرآن کے اسرار وعجائب کبھی ختم ہونے والے نہیں) علمائے امت اور حکمائے امت نے اس کتاب کے دقائق واسرار کا پتہ لگانے اور ہزارہا احکام مستنبط کرنے میں عمریں صرف کر دیں تب بھی اس کی آخر حد تک نہیں پہنچ سکے (علامہ شبیر احمد عثمانی حاشیہ سورہ قمر ۱۵، ص:۶۸۶)

اسی طرح تیسیر للذکر سے تیسیر للاستنباط بھی لازم نہیں آتا اس کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ ترغیب وترہیب کے متعلق قرآن میں جو مضامین ہیں وہ نہایت جلی ہیں اور وجوہ استنباط کا دقیق ہونا تو خود ظاہر ہے۔

(مولانا اشرف علی تھانوی، مکمل بیان القرآن جلد ۱۱، ص:۸۴ آیت مذکور کا فائدہ)

تیسیر قرآن کے وہ نمایاں پہلو جو خود قرآن میں مذکور ہیں حسب ذیل ہیں:

(۱) یہ کتاب عربی مبین میں نازل ہوئی ہے یعنی قریش کی فصیح وبلیغ ٹکسالی زبان میں اس کا نزول ہوا ہے۔

(۲) یہ کتاب بالتدریج نجماً نجماً نازل ہوئی ہے تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بالتدریج اس کو سنائیں اور سکھائیں اور اس کی تعلیمات اچھی طرح ہضم کریں۔اگر پورا قرآن بہ یک دفع نازل کر دیا جاتا تو یہ چیز تیسیر قرآن کے منافی ہوتی۔فرمایا:

وَ قُرآناً فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنَه تَنْزِيلاً۔ (بنی اسرائیل:۱۰۶)

(اور اس قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم ٹھیر ٹھیر کر اسے لوگوں کو سناؤ اور اسے ہم نے (موقع موقع سے) بتدریج اتارا ہے)

(۳) قرآن کی تمام بنیادی تعلیمات پہلے گٹھے ہوئے الفاظ اور فقروں اور چھوٹی چھوٹی جامع اور محکم سورتوں کی شکل میں نازل ہوئیں پھر جب لوگ مانوس ہو گئے تو اللہ نے ان محکم فقروں کی وضاحت فرمائی

Marfat.com

چناں چہ فرمایا:
كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ (هود: ۱)
(فرمان ہے، جس کی آیتیں پختہ ارشاد ہوئی ہیں پھر ان میں تفصیل کر دی گئی ہے ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے)

(۴) قرآن نے تصریف آیات سے خاصا کام لیا ہے۔ ایک ہی بات گونا گوں پہلوؤں سے مختلف شکلوں، مختلف سوابق ولواحق اور نئے اطراف وجوانب کے ساتھ بیان ہوئی ہے تاکہ قاری کے دل میں وہ بات اچھی طرح بیٹھ جائے۔ فرمایا:
كذالِك نُصَرِّفُ الآيَاتِ لِقَومٍ يَّشْكُرُوْنَ (اعراف: ۵۸)
(اسی طرح ہم اپنی آیتوں کو ہیر پھیر کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو شکر گذار ہونے والے ہیں)

(۵) قرآن مکی اور مدنی سورتوں پر مشتمل سات گروپوں میں منقسم ہے یہ ساتوں گروپ مل کر قرآن عظیم کی شکل اختیار کرتے ہیں ہر گروپ کے مطالب مشترک بھی ہیں اور فی الجملہ ایک دوسرے سے ممتاز بھی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن مکتبہ چراغ راہ کراچی، ۱۹۵۱ء، ص: ۹۶-۱۷۱ نیز حمید الدین فراہی، دیباچہ تفسیر سورہ اخلاص)

(۳۳) زمخشری، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل ۱۹۵۳ء، جلد ۴، ص: ۳۴۹
(۳۴) تفسیر ابن کثیر ۴/۴۶۰ سید قطب شہید، فی ظلال القرآن ۲۹/۴ ۲۳۴
(۳۵) تفصیل کے لیے دیکھیے: حمودہ عبدالوہاب، القرآن وعلم النفس ۱۹۶۲ء، ص: ۹۵-۱۰۸
(۳۶) تفصیل کے لیے دیکھیے علی محمد حسن العماری، القرآن والطبائع النفسیۃ ۱۹۶۶ء، ص: ۱۳۱-۱۳۸، اسی طرح فاضل مصنف نے سورہ اعراف اور سورہ نساء کی دو متشابہ المعنی آیات کا تقابلی مطالعہ کیا ہے جس میں بنی اسرائیل کے تئیں رفع جبل کا تذکرہ ہے اور دکھایا ہے کہ کس طرح ذرا ذرا سی لغوی ترمیم اور تھوڑے سے اسلوب کے تغیر کے ساتھ مفہوم کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔
(۳۷) ابو عثمان عمرو بن بحر الجاحظ، کتاب الحیوان حصہ اوّل تحقیق محمد عبدالسلام ہارون، ص: ۹۴
(۳۸) ابو ہلال الحسین بن عبداللہ بن سہل العسکری، کتاب الصناعتین ۱۹۵۲ء، ص: ۱۹۳
(۳۹) دیوان عبید بن الابرص، بیروت ۱۹۵۸ء ص: ۱۴۱-۱۴۲، ابن الشجری مختارات تحقیق محمد حسن زناتی ۱۹۳۵ء ص: ۳۹، عسکری کتاب الصناعتین، ص: ۱۴۴، ابن قتیبہ، تاویل مشکل القرآن ۱۳۷۳م ص: ۱۴۳-۱۸۳، شرح دیوان امرؤالقیس، ۱۳۲۴ھ ہندوستانی ایڈیشن، ص: ۴
(۴۰) ابو العباس المفضل، المفضلیات شرح حسن السندوبی ۱۳۴۵ھ، ص: ۱۹۹، الصاحبی، ص: ۱۹۴، سیبویہ الکتاب: ۱/۳۳۱، ابن قتیبہ، تاویل مشکل القرآن ص: ۱۸۳، الباقلانی اعجاز القرآن تحقیق السید احمد الصقر دار المعارف مصر، ص: ۱۶۰
(۴۱) ابو علی القالی، کتاب الامالی: ۲/۱۲۹، مہذب الاغانی ۱/۱۹۰، فواد افرام البستانی، المہلہل ۱۹۳۹م، ص: ۶-۷
(۴۲) لوئیس شیخو الیسوعی، شعراء النصرانیۃ ۱۸۹۰م، ص: ۲۷۲-۲۷۳
(۴۳) اس قصیدہ کی خبر جب مہلہل کو پہنچی جس نے شاعر کے بیٹے بجیر کو قتل کیا تھا تو اس نے بھی ترکی بہ ترکی

Marfat.com

جوابی قصیدہ کہااور اس نے اپنے اشعار میں قرّبا مربط المشهر منّی کو چودہ بار بطور ترجیع استعمال کیا۔

مشتے نمونہ از خروارے چند اشعار درج ہیں:

١- قرّبا مربط المشهر منی　　لكليب الذى أشاب قذائی
٢- قرّبا مربط المشهر منی　　واسئا لانی ولا تطيلا سوالی
٣- قرّبا مربط المشهر منی　　سوف تبدو لنا ذرات الحجال
٤- قرّبا مربط المشهر منی　　انّ قولی مطابق لفعالی
٥- قرّبا مربط المشهر منی　　لكليب فداه عمی و خالی

(شعراء النصرانية، ص:۲۷۴-۲۷۵)

ترجمہ:

۱۔ مشہر (گھوڑے کا نام) کو مجھ سے قریب لاؤ کلیب (شاعر کا بھائی جو جنگ بسوس میں مارا گیا تھا) کی خاطر جس نے میرے سر پر بڑھاپا طاری کر دیا۔

۲۔ مشہر کو مجھ سے قریب لاؤ اور مجھ سے پوچھو لیکن زیادہ سوالات مت کرنا۔

۳۔ مشہر کو قریب لاؤ عنقریب پردہ نشینان میرے سامنے آ جائیں گی۔

۴۔ مشہر کو مجھ سے قریب لاؤ میرا قول میرے فعل سے ہم آہنگ ہے۔

۵۔ مشہر کو مجھ سے قریب لاؤ کلیب کی خاطر جس پر میرے چچا اور ماموں فدا ہوں۔

(۴۴) ابوزید محمد بن ابوالخطاب القرشی، جمهرة اشعار العرب، ۱۹۶۳ء، ص:۱۴۳

(۴۵) علی حازم و مصطفیٰ امین، البلاغۃ الواضحۃ ۱۹۵۶ء، ص:۲۵۳

(۴۶) حمید الدین فراہی، مجموعہ تفاسیر لاہور، ص:۶۷۳

(۴۷) انبیاء:۵۲-۵۴، "جب انھوں (ابراہیم) نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ یہ مورتیں کیا ہیں جن کی پرستش پر تم جمے بیٹھے ہو۔ وہ بولے، ہم نے اپنے بڑوں کو ان ہی کی پرستش کرتے پایا ہے (ابراہیم نے) کہا کہ بے شک تم اور تمہارے بڑے سب صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں"۔

(۴۸) البلاغۃ الواضحہ، ص:۲۴۹　　(۴۹) محولہ بالا، ص:۲۵۳

(۵۰) علماء نے قرآن کے قصص وواقعات کے سلسلے میں اور بھی مختلف باتیں کہی ہیں۔

(۵۱) جیسا کہ مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی نے قصص القرآن اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے تفہیم القرآن کے مقدّمے میں لکھا ہے۔

(۵۲) مناع القطان، مباحث فی علوم القرآن، الدار السعودیۃ للنشر، ص:۱۵۳

(۵۳) عبدالوہاب حمودہ، القرآن و علم النفس، ص:۱۰۳، نیز تفصیل کے لیے دیکھیے: سید قطب، قرآن کے فنی محاسن ۱۹۸۳ء باب قرآن اور واقعہ نگاری، ص:۲۰۱-۲۱۹

(۵۴) مقالات سلیمان جلد سوم ۱۹۷۱ء، ص:۶۸، سید قطب شہید قرآن کے واقعات کی تکرار پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "..... مگر یہ بات قابل غور ہے کہ پورے واقعہ کو نہیں بلکہ اس کی بعض کڑیوں کو مکرر سہ کرر لایا جاتا ہے۔ خصوصاً ان کڑیوں کو جن میں عبرت و موعظت پر مشتمل مواد مذکور ہوتا ہے۔ جہاں

Marfat.com

تک پورے واقعہ کو دہرانے کا تعلق ہے تو ایسا قرآن میں شاذ و نادر ہی ہوا ہے اور وہ بھی خاص وجوہ و اسباب اور سیاق و سباق کی مناسبت کی بنا پر۔ چناں چہ واقعات کے اغراض بیان کرتے ہوئے ہم اس پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ جب قاری واقعہ کی لائی گئی کڑیوں کا مکرر مطالعہ کرتا اور ساتھ ہی اس کے سیاق و سباق پر نگاہ ڈالتا ہے تو ان کو مکمل طور پر اس واقعہ سے ہم آہنگ پاتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ جس کڑی کو جہاں کہیں بھی لایا گیا ہے اور اس کے لیے جو اسلوب بیان بھی اختیار کیا گیا ہے وہ بالکل درست ہے اس بات کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ بنیادی طور سے قرآن کریم کتاب دعوت ہے اس لیے واقعہ کی جو کڑی ذکر کی گئی ان دونوں میں کامل یک رنگی و ہم آہنگی کا ہونا قرآن کا اولین مقصد ہے اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے مگر واقعہ کا فنی پہلو اس سے متاثر نہیں ہو پاتا" (قرآن کے فنی محاسن ص:۲۲۰)

(۵۵) یہ نکتہ مولانا ابواللیث ندوی نے اپنے ایک مضمون "قرآن میں تکرار کی نوعیت اور قصہ آدم و شیطان" مطبوعہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ، مارچ- مئی ۱۹۳۶ء میں اٹھایا ہے۔

(۵۶) احادیث میں بھی اس امر کی صراحت موجود ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نوید مسیحا اور دعائے خلیل کا مظہر تھی۔

(۵۷) تفہیم القرآن جلد دوم ۱۹۵۸ء، ص: ۲۴۲.

(۵۸) دیوان اوس بن حجر، تحقیق و شرح ڈاکٹر محمد یوسف نجم، ص:۳۶، کتاب الاصنام، ص:۱۷

(۵۹) دیوان عبید بن الابرص، ص:۴۹ دار البیروت، ۱۳۷۷ھ، الشعراء الصعالیک، ص:۲۹۸

(۶۰) دیوان النابغۃ، ص:۷۶، الشعر والشعراء، ص:۶۲، ابو اسحاق نجیری أیمان العرب فی الجاہلیۃ تحقیق محب الدین الخطیب، ص:۱۳

(۶۱) سیرۃ النبی، ج:۱، ص:۳۹ (۶۲) ابن یعیش شرح المفصل:۹/۹۰

(۶۳) المخصص:۱۳/۱۱۰ (۶۴) الکتاب:۱/۵۳۱

(۶۵) ابن قیم التبیان فی أقسام القرآن، ص:۲، علماء کا کہنا ہے کہ بے فائدہ چیزوں کے ذکر سے بچنے کے لیے تاکید کا استعمال ہوتا ہے چناں چہ مخاطب اگر سادہ ذہن کا مالک ہو تو اسے تاکید و قسم کی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر وہ شک و تردد میں مبتلا ہو تو تاکید سے اسے فائدہ پہنچتا ہے اور تاکیدی کلام بہتر ہوتا ہے اور اگر وہ منکر ہو تو اس کے انکار کے حساب سے تاکید و قسم کا اسی قدر استعمال واجب ہو جاتا ہے (دیکھیے البرھان فی علوم القرآن للزرکشی:۲/۳۹۰)

(۶۶) ابن قیم حوالہ بالا، ص:۱۰۰ (۶۷) ابن قیم حوالہ بالا، ص:۱۰۶

(۶۸) حوالہ بالا، ص:۸۸ (۶۹) حوالہ بالا، ص:۱۱۰

(۷۰) امام رازی، مفاتیح الغیب جلد ۷، ص:۱۲۱ (۷۱) محولہ بالا جلد ۷، ص:۶۲۶-۶۲۷

(۷۲) زرکشی، البرہان ۳/۴۰، السیوطی، الاتقان ۴/۴۶

(۷۳) دیکھیے زرکشی ۳/۴۱، اور سیوطی ۴/۴۶ میں قشیری کا کلام

(۷۴) حمید الدین فراہی، اقسام القرآن، ص:۶۸ (۷۵) دیکھیے کتاب الاغانی ۲۳/۳۴۸

(۷۶) دیوان النابغۃ جمع و شرح محمد الطاہر عاشور، ص:۲۳۱

Marfat.com

(۷۷) حمید الدین فراہی، اقسام القرآن طبع دوم، ص:۶۹-۷۰

(۷۸) تفسیر ابن جریر ۱۴/ ۴۴، تفسیر ابن کثیر ۲/ ۵۵۵

(۷۹) علامہ ابن قیم لکھتے ہیں کہ اسلاف واخلاف میں سے اکثر مفسرین اس بات کے قائل ہیں بلکہ اس میں کوئی اختلاف ہی نہیں ہے کہ لَعمرك میں حیات رسول کی قسم کھائی گئی ہے اور مقصد رسول پاک کی تعظیم و تکریم اور تفضیل ہے۔ لیکن زمخشری یہاں تک نہ پہنچ سکے اور یہ نکتہ ان کی سمجھ میں نہ آسکا چناں چہ انہوں نے یہ سمجھا کہ یہاں حیات لوط کی قسم کھائی گئی ہے اور فرشتوں کا قول ہے یعنی فرشتوں نے لوطؑ سے کہا کہ تیری جان کی قسم! حالاں کہ سیاق کلام اس کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ ظاہر الفاظ اور سیاق کلام دونوں یہ بتاتے ہیں کہ یہاں مراد رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ اعتزالی نقطہ نظر غلط ہے (التبیان، ص:۲۷۲-۲۷۳

(۸۰) الکشاف، ۳/ ۴۷۷، القرطبی ۱۶/ ۶۱، الفتوحات الالٰہیہ ۴/ ۷۶، فتح القدیر ۴/ ۵۴۷

(۸۱) تفسیر ابن جریر ۳۰/ ۲۳۱، الکشاف ۴/ ۲۶۳ (۸۲) الاشارہ الی الایجاز فی بعض انواع المجاز، ص:۲۲

(۸۳) حمید الدین فراہی، رسالہ الامعان فی اقسام القرآن

(۸۴) ابن کثیر نے مجاہد، سدی اور ابن جریج وغیرہ کی طرف اس قول کو منسوب کیا ہے اور مَا على الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ من شيءٍ کا مطلب یہ لیا ہے کہ اگر یہ لوگ کفار و مشرکین کے ساتھ بیٹھ جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن نساء کی مندرجہ بالا آیت نے ان کے اس مفہوم پر یہ کہہ کر خط نسخ پھیر دیا کہ إنكم اذًا مثلهم (اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انہیں کی طرح ہو) تفسیر ابن کثیر حصہ دوم ص:۱۴۴۔ تفسیر ابن جریر تحقیق محمود محمد شاکر:۱۱/ ۴۴۰

(۸۵) امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن:۲/ ۴۵۴-۴۵۵

(۸۶) مثال کے طور پر دیکھیے سورہ الزخرف آیت ۳۶، ۳۷، اور سورہ یوسف آیت:۱۰۔

(۸۷) یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ خطاب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا ہے لیکن یہ حکم دراصل تمام قاضیوں اور فیصلہ کرنے والوں کے لیے عام ہے اس لیے خطاب بعد میں جمع کے صیغے سے کیا گیا گویا نبی اپنی ذات سے پوری امت اور قوم کا نمائندہ ہے نبی کو مخاطب کرنے سے بات زیادہ پرزور اور موثر ہو جاتی ہے سورہ نصر میں آپ کو جس استغفار کا حکم دیا گیا ہے اس کی بھی یہی نوعیت ہے۔

یہاں اس اسلوب میں ایک قابل غور پہلو اور ہے وہ یہ کہ اس میں ان لوگوں سے ایک قسم کی بے التفاتی و بے پروائی کا اظہار ہو جاتا ہے جن کی سرزنش مقصود ہوتی ہے گویا وہ لائق خطاب نہیں ہیں اس وجہ سے اللہ نے اپنے رسول کو مخاطب کر کے وہ بات فرمادی جو فرمانی تھی۔ قرآن میں اس طرح کے جو خطاب وارد ہوئے ہیں بالعموم کلام کے تدریجی ارتقاء سے ان کا اصل رخ بھی واضح ہو گیا ہے۔

(۸۸) عبداللہ بن معتز کہتا ہے کہ التفات یہ ہے کہ متکلم مخاطبت سے اخبار کی طرف اور اخبار سے مخاطبت کی طرف پلٹ جائے (البدیع لطفی الحلبی ایڈیشن ۱۳۶۴ھ، ص:۱۰۶)

(۸۹) جریر، دیوان جریر، الصاوی ۱۳۵۳ھ، ص:۵۱۲/ ابن المعتز، البدیع، ص:۱۰۷، العسکری کتاب الصناعتین ۱۳۲۰ھ، ص:۳۱۱/ لسان العرب:۱۴/ ۳۱۷، ابن رشیق کتاب العمدۃ، التجاریۃ ۱۳۵۳ھ، ۲/ ۴۴

(۹۰) دیوان جریر ۵۱۲، البدیع ۱۰۷، لسان العرب ۱۹/ ۶۸

Marfat.com

(۹۱) دیوان جریر ۳۰۴، البدیع، ص:۱۰۷، العمدۃ ۲/ ۴۲، کتاب الصناعتین:۳۱۱
(۹۲) ایسا بھی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے اور آپؐ کے واسطہ سے ہی تمام لوگوں کو مخاطب کرتا ہے۔ کیوں کہ قرآن پاک میں بکثرت ایسی آیات موجود ہیں جہاں کلام کی یہ توجیہ ممکن نہیں ہے مثال کے طور پر دیکھیے سورۂ المائدہ، آیت:۱۵، وغیرہ
(۹۳) مثال کے طور پر سورہ فاتحہ کو دیکھیے جو پوری کی پوری وہ دعا ہے جو بندوں کو اللہ نے سکھائی ہے۔
(۹۴) اس آیت کی تفسیر میں زبردست اختلاف ہے۔ دیکھیے: تفسیر ابن کثیر ۳/ ۱۳۲-۱۳۳، شوکانی، فتح القدیر ۳/ ۳۴۴، اس مفہوم کی تائید میں احادیث بھی وارد ہیں۔ دیکھیے: جمع الفوائد، ج:۲، کتاب القیامۃ واحوالہا بحوالہ مسلم اور مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی کتاب الفتن فی الحوض والشفاعۃ۔
(۹۵) ابن ہشام السیرۃ النبویۃ، ۱۹۵۵ء، ۱/ ۶۳۸-۶۳۹
(۹۶) القرشی جمہرۃ اشعار العرب، ص:۱۰۰ (۹۷) محولہ بالا، ص:۲۸۶
(۹۸) النجم سے بعض لوگوں نے زمین پر پیدا ہونے والے چھوٹے چھوٹے جھاڑ اور بیلوں وغیرہ کے قسم کی چیزیں مراد لی ہیں مثال کے طور پر شوکانی نے لکھا ہے کہ النجم ما لا ساق له من النبات والشجر مالهٗ ساقٌ (نجم اس پودے کو کہتے ہیں جس میں تنا نہ ہو اور شجر تنا والے پودے کو کہتے ہیں) (فتح القدیر ۵/ ۱۳۱)
(۹۹) اسی مفہوم کو ایک دوسری آیت میں کھول کر رکھ دیا گیا ہے۔ یٰسٓ آیت:۴۰)
(۱۰۰) اگرچہ مفسرین نے ان دونوں میں کسی قدر فرق کیا ہے مثال کے طور پر العلیّ کے معنی المتعالی بذاته عن الأشباه والانداد (جو نظائر و امثال سے ماوراء ہو) کے ہیں اور العظیم کے معنی الذی یتحقر بالنسبة الیه کل ما سواه (جس کے مقابلہ میں ہر چیز حقیر اور چھوٹی ہو) کے لیے ہیں (تفسیر ابی السعود ۱/ ۱۸۹) لیکن معنی اور روح کے اعتبار سے کوئی زیادہ فرق نہیں ہے زمخشری نے لکھا ہے کہ یہ دونوں الفاظ خدا کی جلالت قدر اور عظمت و مرتبہ کو نمایاں کرنے کے لیے مستعمل ہوئے ہیں (الکشاف:۱/ ۲۳۰)
(۱۰۱) باقلانی نے لکھا ہے کہ حذف کا مطلب یہ ہے کہ کلام کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کچھ الفاظ یا جملے ساقط کر دیے جائیں اور مثال میں یہ آیت پیش کی ہے واسئل القریة یعنی أهل القریة (اعجاز القرآن، ص:۳۹۷)
(۱۰۲) جرجانی، دلائل الاعجاز بتحقیق محمد بن تاویت ۱/ ۸۶
(۱۰۳) القرشی، جمہرۃ اشعار العرب، ص:۲۶۷
(۱۰۴) محولہ بالا، ص:۱۸۸ (۱۰۵) محولہ بالا، ص:۱۲۰
(۱۰۶) محولہ بالا، ص:۲۸۸
(۱۰۷) ابو تمام، دیوان الحماسہ بتحقیق محمد عبد المنعم خفاجی، ۱۹۵۵ء، ۱/ ۴۶۵
(۱۰۸) محولہ بالا جلد دوم، ص:۳۱
(۱۰۹) محولہ بالا جلد اول، ص:۴۸۵
(۱۱۰) مفسرین نے علامہ فراہی کے بقول اس آیت کا صحیح ترجمہ نہیں کیا ہے۔
(۱۱۱) اکثر لوگ یہاں تقوی کے لفظ کو محذوف نہیں مانتے ان کے نزدیک تَزَوَّدُوْا کے لفظ سے لوگوں کو حج کے لیے مادی زاد راہ لے کر نکلنے کی تاکید کی گئی ہے۔

Marfat.com

(۱۱۲) ابو ہلال عسکری، کتاب الصناعتین، ص:۳۶ بعض کتابوں میں یہ شعر کسی قدر تبدیلی کے ساتھ نقل ہوا ہے مثلاً شعراء النصرانیہ کا مصنف یوں نقل کرتا ہے:

والنوك خير فیٰ ظلال العیش ممن عاشَ كدّا (ص:۴۱۷)

(۱۱۳) ابو تمام کتاب الحماسہ ۱/۸۱

(۱۱۴) مشہور مخضرمی شاعر جعفر بن علبہ حارثی کا شعر ہے ابو تمام کتاب الحماسہ ۱/۲۷

(۱۱۵) حضرت حسان بن ثابتؓ نے یہ مرثیہ جنگ موتہ کے شہداء پر کہا تھا۔ دیوان حسان بن ثابت انصاری، بیروت، ۱۹۶۶ء، ص:۹۹

(۱۱۶) دیوان امروَالقیس، بیروت ۱۹۵۸ء، ص:۱۴۱ (۱۱۷) دیوان حسان بن ثابت انصاری، ص:۵۸

(۱۱۸) یہ جاہلی شاعر عمرو بن قمیہ کا شعر ہے کتاب الحماسہ بتحقیق عبدالمنعم خفاجی ۲/۱۷۔ عام طور پر لوگوں نے ان مواقع پر إذ کو زائد تصور کیا ہے حالاں کہ قرآن میں کوئی لفظ یا حرف بھی زائد نہیں ہے بلکہ اپنے اندر معانی کا بے کراں سمندر رکھتا ہے۔ دیکھیے ابن ہشام مغنی اللبیب ۱/۱۳۴۔ زمخشری، الکشاف ۱/۵۳۳

(۱۱۹) دیوان المتنبی ۱۲۰۷ھ، ص:۱۷۱

(۱۲۰) دیوان ابن الرومی مع شرح شیخ محمد شریف سلیم، ۱۹۱۷ء، ۱/۳۸۸

(۱۲۱) محولہ بالا جلد اول، ص:۳۸۶

(۱۲۲) دیوان البحتری مع شرح حسن کامل الصیرفی ۱۹۶۴ء، ۳/۲۰۱۰

(۱۲۳) دیوان المتنبی، ص:۳۳۷

(۱۲۴) دیوان ابی تمام مع شرح الخطیب التبریزی بتحقیق محمد عبدہ عزام ۲/۱۳۰

(۱۲۵) دیوان المتنبی، ص:۳۶۲ (۱۲۶) دیوان البحتری:۱/۸۶

(۱۲۷) دیوان المتنبی، ص:۳۳۹ (۱۲۸) البلاغۃ الواضحۃ، ص:۲۰۵

(۱۲۹) محولہ بالا، ص:۲۰۱ (۱۳۰) محولہ بالا، ص:۱۹۷

(۱۳۱) محولہ بالا، ص:۲۰۴ (۱۳۲) دیوان البحتری بتحقیق رشید عطیہ بیروت ۱۹۱۱ء، ۱/۲۱۷

(۱۳۳) دیوان ابی تمام مطبع حجازی قاہرہ، ۱۳۶۱ھ، ص:۴۰۲

(۱۳۴) دیوان امروَالقیس، بیروت، ۱۹۵۸ء، ص:۹۵

(۱۳۵) دیوان ابی تمام بتحقیق محمد عبدالمنعم خفاجی، ۱۳۷۴ھ، ۱/۶۰۰

(۱۳۶) اشرف علی تھانوی بیان القرآن، جلد ۸، ص:۲۴ کا حاشیہ دیکھیے

(۱۳۷) دیوان امروَالقیس دار المعارف، مصر ۱۹۵۸ء، ص:۳۷۹

(۱۳۸) محولہ بالا، ص:۹۰ (۱۳۹) محولہ بالا، ص:۷۴

(۱۴۰) جمہرۃ اشعار العرب، ص:۱۰۲ (۱۴۱) محولہ بالا، ص:۱۲۷

(۱۴۲) محولہ بالا، ص:۲۷۷ (۱۴۳) محولہ بالا، ص:۲۷۸

(۱۴۴) محولہ بالا، ص:۲۴۲ (۱۴۵) محولہ بالا، ص:۲۴۴

(۱۴۶) محولہ بالا، ص:۱۳۳ (۱۴۷) دیوان امروَالقیس، ص:۹۶

Marfat.com

(۱۴۸) شعراء النصرانیۃ، ص:۳۲۰ (۱۴۹) محولہ بالا ص:۳۲۷

(۱۵۰) مجموعہ تفاسیر فراہی مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان، ص:۵۶۰

(۱۵۱) شرح دیوان جریر تحقیق محمد اسماعیل عبداللہ انصاری ۱۳۵۳ھ، ص:۴۷۵

(۱۵۲) قرآن اس تشبیہ کو یوں استعمال کرتا ہے:

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيَاحُ (کہف: ٤٥)

(اور ان کے لیے دنیا کی زندگی کی مثال بیان کرو کہ جیسے آسمان سے ہم نے پانی اتارا اور زمین کی نباتات اس سے سیراب ہو کر خوب اپجیں پھر وہ خشک ہو کر ریزہ ریزہ ہو گئیں جن کو ہوائیں اِدھر اُدھر اڑائے لیے پھرتی ہیں)

(۱۵۳) شعراء النصرانیۃ، ص:۴۴۳

(۱۵۴) جامع ترمذی مطبع مجیدی کانپور، ابواب البر والصلۃ، ص:۲۳

(۱۵۵) سیرت النبی، ابن ہشام الجزء الاول، دار الفکر، ۱۹۳۵ء ص:۲۹۸

(۱۵۶) دیوان حسان بن ثابت انصاری، دار صادر، بیروت ۱۹۶۶ء، ص:۱۸۰

(۱۵۷) جامع ترمذی، ابواب البر والصلۃ، ص:۲۳

(۱۵۸) ان آیات کی تفسیر میں بڑا زبردست اختلاف ہے۔ بعض لوگوں نے تمام آیات کو ہوا پر محمول کیا ہے جس کی ترجمہ میں رعایت رکھی گئی ہے اور بعض لوگوں نے ملائکہ کو مراد لیا ہے اور کچھ لوگوں نے تفریق کی ہے۔ ابن کثیر نے مرسلات اور عاصفات سے ہواؤں کو اور آگے کی آیات سے ملائکہ کو مراد لیا ہے صاحب التسہیل نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے محمد علی الصابونی (صفوۃ التفاسیر ۱۹/۹۱) نے بھی اسی رائے کو ترجیح دی ہے لیکن پہلی تاویل زیادہ اقرب الی الصواب معلوم ہوتی ہے۔

(۱۵۹) چناں چہ حضرت علی بن ابی طالبؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، محمد بن کعبؒ، ابو صالحؒ اور مفسرین کا ایک طبقہ اس سے مراد اونٹوں کو لیتا ہے لیکن حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حسنؒ اور دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں گھوڑے مراد ہیں ابن جریر کہتے ہیں کہ "دونوں اقوال میں سے یہی قول قابل ترجیح ہے کہ دوڑنے والوں سے مراد گھوڑے ہیں کیوں کہ اونٹ ضبح نہیں کرتا گھوڑا ہی ضبح کرتا ہے اور اللہ نے فرمایا ہے کہ "ان دوڑنے والوں کی قسم جو دوڑتے ہوئے ضبح کرتے ہیں" امام رازی کہتے ہیں کہ "ان آیات کے الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مراد گھوڑے ہیں کیوں کہ ضبح کی آواز گھوڑے کے سوا کسی سے نہیں نکلتی اور آگ جھاڑنے کا فعل بھی پتھروں پر سموں کی ٹاپ پڑنے کے سوا کسی اور طرح کے دوڑنے سے نہیں ہوتا اور اسی طرح صبح سویرے چھاپہ مارنا بھی دوسرے جانوروں کی بہ نسبت گھوڑوں ہی کے ذریعہ سے سہل ہوتا ہے۔" فراء اور زجاج کا اختیار کردہ قول یہی ہے۔ (دیکھیے ابن قیم جوزیہ التبیان فی اقسام القرآن، ص:۷۵-۷۹)

(۱۶۰) الاتقان، ج:۲، ص:۷۵

(۱۶۱) حوالہ بالا

(۱۶۲) دیوان النابغہ الذبیانی، المکتبہ الاہلیۃ بیروت ۱۹۲۹ء، ص:۶۹

Marfat.com

(۱۶۳) البلاغۃ الواضحہ، ص:۲۵۲

(۱۶۴) محولہ بالا

(۱۶۵) علامہ ابن کثیر اور علامہ زمخشری (۴/۴۹) اور متاخرین میں مولانا مودودی (تفہیم القرآن ۴/۳۱۲) وغیرہ نے یہاں جن سے مراد فرشتوں کو لیا ہے۔ ان کی تاویل کے مطابق یہاں جن اپنے لغوی مفہوم (پوشیدہ مخلوق) میں استعمال ہوا ہے اور ملائکہ بھی اصلاً ایک پوشیدہ مخلوق ہیں۔

(۱۶۶) الاتقان جلد دوم، ص:۲۲۶

(۱۶۷) دیوان المتنبی، دیوبند، ص:۴۳۳

(۱۶۸) دیوان ابن معتز، ص:۳۶۴

(۱۶۹) جمہرۃ اشعار العرب، ص:۱۶۶

(۱۷۰) محولہ بالا، ص:۲۵۱

(۱۷۱) اس آیت کی تاویل میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔ نحویوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ یہاں لمّا کا جواب محذوف ہے اور اس کو سامع کے ذہن پر چھوڑ دیا گیا ہے کیوں کہ بات اتنی بڑی تھی کہ اسے الفاظ میں بیان کرنے کے بجائے تصور کے لیے چھوڑ دینا زیادہ مناسب تھا یعنی جب اللہ نے دیکھا ہوگا کہ بوڑھا باپ اپنے ارمانوں سے مانگے ہوئے بیٹے کو محض ہماری خوشنودی پر قربان کر دینے کے لیے تیار ہو گیا ہے اور بیٹا بھی گلے پر چھری چلوانے کے لیے راضی ہے تو یہ منظر دیکھ کر کیسا کچھ دریائے رحمت نے جوش مارا ہوگا اور مالک کو ان باپ بیٹوں پر کیسا کچھ پیار آیا ہوگا اس کا بس تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ الفاظ میں اس کی کیفیت جتنی کچھ بھی بیان کی جائے گی وہ اس کو ادا نہیں کرے گی بلکہ اس کی اصلی شان سے کچھ گھٹ کر ہی ہو گی۔ (دیکھیے سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن جلد چہارم، ص:۲۹۶، امین احسن اصلاحی تدبر قرآن جلد پنجم، ص:۴۸۷، زمخشری الکشاف ۴/۴۲، اشرف علی تھانوی مکمل بیان القرآن ۹/۱۲۸)

ایک دوسرا نقطہ نظر وہ ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے اور یہ رائے کوفہ کے نحویوں اور اخفش کی ہے (دیکھیے: محمد جمال الدین قاسمی، تفسیر قاسمی ۱۴/۵۰۵۱)

(۱۷۲) بالکل وہی اختلاف زیر بحث آیت میں بھی ہے۔ یہاں میرے موقف کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ اسی سورہ میں اوپر یہ ترکیب عیاں ہو کر سامنے آگئی ہے اور جہنمیوں کے تذکرے میں جواب شرط پر واؤ داخل نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى جَهَنَّمَ زُمَرًا حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَ قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ (زمر:۷۱)

(اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا تھا جہنم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے پاسبان ان سے کہیں گے کیا تمہارے پاس اپنے لوگوں میں سے رسول نہیں آئے تھے؟)

مفسرین نے لکھا ہے کہ جہنم کے دروازے بند ہوں گے جب مجرم وہاں پہنچیں گے تو وہ کھولے جائیں گے جس طرح مجرموں کے پہنچنے پر جیل کا دروازہ کھولا جاتا ہے اور ان کے داخل ہوتے ہی بند کر دیا جاتا ہے

Marfat.com

لیکن جنت کا معاملہ مختلف ہوگا وہ جنتیوں کے انتظار میں کھلے ہوں گے اور انہیں مرحبا کہنے کے لیے بے چین ہوں گے۔ (تفسیر قاسمی ۱۴/ ۵۱۵۲)

(۱۷۳) علامہ جمال الدین قاسمی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ آخری جملہ پہلے جملے پر معطوف ہے اور کما کانوا کے مفہوم میں ہے اور کما میں تشبیہ و تمثیل کے ساتھ سببیت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے (جلد:۷، ص:۲۶۹۶)

(۱۷۴) الاتقان، ج:۲، ص:۱۷-۲۷

(۱۷۵) بعض لوگوں نے اس جملے کا الٹا مطلب یہ نکال لیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود حضرت زینبؓ سے نکاح کے خواہش مند تھے اور آپ کا جی چاہتا تھا کہ حضرت زید انہیں طلاق دے دیں مگر جب انھوں نے آکر عرض کیا کہ میں بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہوں تو آپ نے معاذ اللہ اوپری دل سے انہیں منع کیا اس پر اللہ تعالی فرمارہا ہے کہ "تم دل میں وہ بات چھپا رہے تھے جسے اللہ ظاہر کرنا چاہتا تھا" حالاں کہ اس طرح کی تمام باتیں غلط ہیں۔ ابن کثیر کا یہ تبصرہ بالکل درست ہے کہ:

أحببنا ان نضرب عنها صفحاً لعدم صحتها فلا نوردها (تفسیر ابن کثیر ۳/ ۴۹۱)

(یہ روایات بے اصل ہیں اس وجہ سے ہم نے ان سے صرف نظر کرنا ہی پسند کیا اور ان کو نقل نہیں کر رہے ہیں)

(۱۷۶) یہاں یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر قریش فرشتوں کو خدا کی نر اولاد قرار دیتے تو بات صحیح ہوتی اور یہاں فرشتوں کو بیٹیاں قرار دینے پر تہدید کی جارہی ہے بلکہ کہنا یہ ہے کہ اول تو خدا کی طرف بیٹوں اور بیٹیوں کی نسبت ہی ایک شدید قسم کی جہالت ہے لیکن انھوں نے جہالت پر جہالت یہ کی ہے کہ خدا کے لیے انہوں نے وہ چیز پسند کی ہے جو اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں حالاں کہ عقل و فطرت کا تقاضا اس کے برعکس ہے۔

(۱۷۷) بعض کے نزدیک یہ تبصرہ ان اہل عرب کی طرف سے ہے جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ ان کے خیال میں مفسرین کو اس آیت کے سمجھنے میں جو غلطی ہوئی ہے وہ کلام کے سیاق پر غور نہ کرنے کی وجہ سے ہوئی ہے (دیکھیے: تدبر قرآن جلد ششم، ۱۹۷۸ء، ص:۲۱۶) لیکن جمہور مفسرین اس کی نسبت اللہ کی طرف کرتے ہیں اور ان کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو نرم و نازک اور ضعیف و کمزور، ناقص العقل اور اپنی بات پوری طرح واضح نہ کرسکنے والی اولاد ہے وہ تم نے اللہ کے حصے میں ڈال دی اور خم ٹھونک کر میدان میں اترنے والی اولاد خود لے اڑے؟ (دیکھیے ابن کثیر ۴/ ۱۲۵، شوکانی فتح القدیر ۴/ ۵۴۹ وغیرہ)

اس آیت سے فقہاء نے عورتوں کے لیے زیور کے جواز کا پہلو بھی نکالا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے (تفہیم القرآن ۴/ ۵۳۱-۵۳۲)

Marfat.com

کتابیات

۱- ابن کثیر و منہجہ فی التفسیر، ڈاکٹر اسماعیل سالم عبدالعال، مکتبہ ملک فیصل الاسلامیۃ ۱۹۸۴ء

۲- الاتقان فی علوم القرآن، سیوطی، مصر ۱۲۷۹ھ

۳- احکام القرآن۔ ابو بکر جصّاص، مصر ۱۳۴۷ھ

۴- اسالیب القرآن۔ حمید الدین فراھی، اعظم گڑھ ۱۳۸۹ھ

۵- اسباب النزول۔ علی بن احمد الواحدی النیسابوری۔ قاھرہ، ۱۹۶۸ء

۶- اعجاز القرآن والبلاغۃ النبویۃ، مصطفی صادق رافعی، مصر- ۱۳۸۹ھ

۷- اعجاز القرآن۔ عبدالکریم الخطیب، دارالفکر العربی، ۱۳۷۳ھ

۸- اعجاز القرآن، الباقلانی، بتحقیق السید احمد الصقر، دارالمعارف، مصر

۹- امالی المرتضی - تحقیق محمد ابو الفضل ابراھیم، دار احیاء الکتب العربیۃ قاھرہ، ۱۹۵۴ء

۱۰- امثال القرآن، شمس الدین ابن قیم الجوزیۃ ، مکۃ المکرمۃ ۱۹۸۰ء بعنایۃ ناصرالرشید

۱۱- بحث فی ترجمۃ القرآن الکریم و احکامہا، محمد مصطفی المراغی، بیروت ۱۹۸۱ء

۱۲- البرھان فی علوم القرآن، بدرالدین محمد عبداللّٰہ زرکشی، تحقیق محمد ابو الفضل ابراھیم ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸م

۱۳- بصائر ذوی التمیز فی لطائف الکتاب العزیز، مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی

۱۴- بلاغۃ القرآن، محمد الخضر الحسین، دمشق ۱۹۷۱ء

۱۵- تاریخ فکرۃ اعجاز القرآن، نعیم الحمّصی، المجمع العلمی العربی دمشق ۱۹۵۰ء

۱۶- تاریخ القرآن، محمد طاہر بن عبدالقادر الکروی، قاھرہ الحلبی ۱۹۵۳ء

۱۷- تاریخ القرآن، عبدالصبور شاہین، قاہرہ ۱۹۶۶ء

۱۸- تاویل مشکل القرآن، ابن قتیبہ ۱۳۷۳ھ

۱۹- التبیان فی اقسام القرآن، ابن قیّم، مکتبہ التجاریۃ الکبریٰ، قاھرہ ۱۹۳۳ء

Marfat.com

۲۰- التبیان فی علوم القرآن۔ محمد علی الصابونی، دارالارشاد ۱۹۷۰ء

۲۱- تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنّان، محمود علی المہائمی، مطبعة بولاق، مصر

۲۲- التصویر الفنّی فی القرآن، سید قطب شہید، الطبقة الثالثة، مصر

۲۳- التعریف والاعلام بما انبئہم فی القرآن عن الاسماء والاعلام، ابوالقاسم عبدالرّحمٰن السہیلی

۲۴- تفسیر ابن کثیر طبعة عیسی الحلبی ۱۲۴۵ھ - ۱۳۴۷ھ

۲۵- تفسیر ابوالسعود المسمّٰی ارشاد العقل السلیم الی مزایا القرآن الکریم۔ مطبعہ محمد علی صبیح، قاہرہ

۲۶- تفسیر بیضاوی، قاضی نصیر الدین شیرازی بیضاوی، المطبعة العثمانیہ، مصر ۱۳۰۵ھ

۲۷- التفسیر البیانی للقرآن الکریم، عائشہ عبدالرّحمٰن بنت الشاطئ، دارالمعارف، قاہرہ ۱۹۶۲ء

۲۸- التفسیر الحدیث، محمد عزہ دروزہ، دار احیاء الکتب العربیة ۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۲ء

۲۹- تفسیر الخازن، مطبعة بولاق، الطبعة الاولٰی

۳۰- تفسیر القاسمی المسمّٰی بہ محاسن التاویل، محمد جمال الدین قاسمی، دار احیاء الکتب العربیة ۱۹۱۴ء

۳۱- تفسیر القرآن بکلام الرّحمٰن، ثناء اللّٰہ امرتسری، امرتسر ۱۳۲۱ھ

۳۲- تفسیر کبیر، فخر الدین رازی، مطبوعہ ۱۳۰۸ھ

۳۳- تفسیرالمراغی، احمد مصطفٰی المراغی، مطبعة مصطفٰی البابی ۱۹۵۳ء

۳۴- تفسیر مظہری، قاضی ثناء اللّٰہ پانی پتی، ندوة المصنّفین، دہلی

۳۵- التفسیر الموضوعی للقرآن الکریم، محمد البہی، مکتبہ وہبہ، قاہرہ ۱۹۷۶م

۳۶- التفسیر المیسّر، عبداللّٰہ خیّاط، مکتبہ النجاح، جدّہ ۱۳۹۲ھ

۳۷- تفسیر سورہ اخلاص، ابن تیمیہ، المطبعة الحسینیة المصریة ۱۳۲۲ھ

۳۸- تفسیر سورہ بقرہ، ڈاکٹر مصطفٰی زید ۱۹۶۲ء

۳۹- التفسیر معالم حیاتہ منہجتہ الیوم، استاذ امین الخولی، جماعة الکتاب ۱۹۴۴ء

۴۰- التفسیر و رجالہ، شیخ محمد فاضل بن عاشور، سلسلہ البحوث الاسلامیة ۱۳۹۰ھ / ۱۹۷۰م

۴۱- التفسیر والمفسرون، استاذ محمد حسین الذہبی، دارالکتب الحدیثہ ۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۱ء

Marfat.com

۴۲- تفصیل آیات القرآن الکریم، محمد فواد عبدالباقی، مصر

۴۳- التقریر فی التکریر، محمد ابوالخیر عابدین

۴۴- التکمیل فی اصول التأویل، حمید الدین فراہی، اعظم گڑھ ۱۳۸۸ھ

۴۵- تنزیه القرآن عن المطاعن، القاضی عبدالجبار بن احمد المعتزلی، بیروت

۴۶- جامع البیان عن تاویل آیات القرآن، ابو جعفر محمد بن جریر طبری، مطبعه مصطفی الحلبی ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۴م

۴۷- الجامع الأحکام القرآن، ابو عبدالله محمد بن احمد الانصاری القرطبی، قاهره ۱۹۴۵ء

۴۸- دلائل النظام، حمید الدین فراہی، اعظم گڑھ ۱۳۸۸ھ

۴۹- دلائل الاعجاز عبدالقاهر جرجانی تحقیق محمد بن تاویت

۵۰- روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، ابوالفضل شهاب الدین آلوسی مطبعة لولاق ۱۳۰۱ھ

۵۱- زادالمسیر فی علم التفسیر، ابن الجوزی، بیروت، ۱۹۶۵ء

۵۲- سورة الاحزاب عرض و تفسیر، ڈاکٹر مصطفی زید، دارالفکر العربی ۱۳۸۹ھ / ۱۹۶۹م

۵۳- الصاحبی فی فقه اللغه و سنن العرب فی کلامها، احمد بن فارس، مکتبه سلفیه قاهره ۱۹۱۰ء

۵۴- صفوة التفاسیر، محمد علی الصابونی، دارالقرآن الکریم، بیروت ۱۹۸۱ء

۵۵- ضبط اسماء الانبیاء علیهم السلام الذین ذکروا فی القرآن، احمد العدوی

۵۶- طبقات المفسرین، سیوطی، طبعة طهران ۱۹۶۰ء

۵۷- عمدة التفسیر، احمد محمد شاکر، دارالمعارف ۱۳۷۶ھ / ۱۹۵۶م

۵۸- فتح القدیر بین فنّی الروایة والدرایة من علم التفسیر، محمد بن علی شوکانی، مطبعة مصطفی البابی، قاهره ۱۳۸۳ھ / ۱۹۶۴م

۵۹- فتح المنان فی بیان مشاہیر الرسل فی القرآن، احمد السجاعی

۶۰- الفوائد المشوق الی علوم القرآن، سیوطی

۶۱- الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، شاه ولی الله، لاہور ۱۹۵۱ء

۶۲- فی ظلال القرآن ۳۰ حصے سید قطب شهید، قاہره الطبعة الثانیة

۶۳- القرآن و الطبائع النفسیة، علی محمد حسن العماری ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء

۶۴- القرآن و علم النفس، حموده عبدالوهاب، دارالقلم، قاهره ۱۹۶۲ء

Marfat.com

۶۵- قصة التفسير، شيخ احمد الشرباص، سلسلة المكتبة الثقافية ۱۹۶۲ء

۶۶- الكشاف عن حقائق غوامض التنزيل، زمخشری، مطبعة الاستقامة قاهره ۱۹۴۶م

۶۷- مباحث فی علوم القرآن، منّاع القطان، الدارالسعودية للنشر

۶۸- مبادی التفسير، شيخ محمد الخضرمی، مطبعة النيل ۱۳۲۱هـ/۱۹۰۳م

۶۹- مجموعه تفسير شيخ الاسلام ابن تيميه مطبعة (ق) بمبئی ۱۳۷۴هـ / ۱۹۵۴م

۷۰- مدخل الی القرآن الكويم، محمد عبدالله دراز، كويت ۱۹۷۱م

۷۱- مسئلة ترجمة القرآن الكريم، شيخ الإسلام مصطفیٰ صبری، قاهره ۱۳۵۱هـ

۷۲- مع القرآن الكريم فی تاريخه و خصائصه و احكامه، شعبان محمد اسماعيل، قاهره، ۱۹۷۸ء

۷۳- معترك الاقرآن فی اعجاز القرآن، سيوطی، قاهره ۱۹۶۹ء بعناية علی محمد البجاوی

۷۴- المرشد الی آيات القرآن الكريم و كلماته، محمد فارس بركات، طبع دوم ۱۹۵۷ء

۷۵- مع المفسرين والكتاب، استاذ محمد احمد جمال، دارالكتاب العربی ۱۳۷۳هـ / ۱۹۵۴م

۷۶- المعجم المفهرس لالفاظ القرآن الكريم، محمد فوأد عبدالباقی، مطابع الشعب ۱۳۷۹هـ

۷۷- معجم آيات القرآن، ڈاكٹر حسين نصار، مطبعة مصطفی البابی الحلبی، مصر ۱۳۷۳هـ / ۱۹۵۴م

۷۸- مع القرآن العظيم، استاذ محمد لبيب البوهی، دارالطباعة الحديثه

۷۹- معالم التنزيل، تفوی، مطبوع علی هامش تفسير ابن كثير، طبعة المنار

۸۰- مفتاح التفاسير، حافظ محمد شريف، ۱۲۹۹هـ

۸۱- المفردات فی غريب القرآن، راغب اصفهانی، مصر ۱۹۶۱ء

۸۲- مقدمة فی اصول التفسير، ابن تيميه، مطبع الترقی دمشق

۸۳- من بلاغة القرآن، احمداحمد بدوی مكتبه نهضه، مصر، البطعة الثانية

۸۴- مناهل العرفان فی علوم القرآن، الجزء الاول والثانی، محمد عبدالعظيم الزرقانی ۱۳۷۲هـ / ۱۹۵۳ء

۸۵- منهج الزمخشری فی تفسير القرآن، ڈاكٹر مصطفیٰ الجوينی، دارالمعارف ۱۹۲۸ء

۸۶- النبأ العظيم، ڈاكٹر محمد عبدالله دراز، مكتبه السعادة، مصر ۱۹۵۷ء

۸۷- النسخ فی القرآن الكريم، ڈاكٹر مصطفیٰ زيد، دارالفكر العربی ۱۳۸۳هـ

Marfat.com

۸۸- نشأة التفسیر فی الکتب المقدسه والقرآن، ڈاکٹر سید احمد خلیل ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۴ء
۸۹- نظرات فی القرآن، محمد الغزالی، المکتب التجاری، بیروت ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء
۹۰- نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور، برهان الدین ابوالحسن ابراهیم بن عمر بقاعی دائرة المعارف حیدر آباد دکن ۱۹۷۸ء

۹۱- ایمان العرب فی الجاهلیة، ابو اسحاق بحتری، تحقیق محب الدین الخطیب
۹۲- البدیع، عبداللّٰه بن معتز، شرح و تعلیق محمد عبدالمنعم خفاجی، مطبعة مصطفٰی البابی
۹۳- البلاغة الواضحة، علی حازم و مصطفٰی امین، دارالمعارف، مصر ۱۳۷۵ھ / ۱۹۵۶م
۹۴- تاج العروس، سید محمد مرتضٰی زبیدی، دار لیبیا للنشر والتوزیع، بیروت ۱۹۶۶م
۹۵- ترمذی، مطبوعه رشیدیه دہلی
۹۶- التکمیل فی اصول التأویل، حمید الدین فراہی، اعظم گڑھ ۱۳۸۸ھ
۹۷- جمع الفوائد من جامع الاصول، مطبعه خیریه میرٹھ ۱۳۴۶ھ
۹۸- جمهرة اشعار العرب، ابو زید محمد بن عبد ابو الخطاب القرشی، دار بیروت ۱۹۶۳ء
۹۹- جمهرة البلاغة، حمید الدین فراہی، معارف اعظم گڑھ ۱۳۶۰ھ
۱۰۰- جمهرة خطب العرب فی عصور العربیة الزاهرة، احمد ذکی صفوت، قاهره ۱۹۳۲م
۱۰۱- حیاة محمد، ڈاکٹر محمد حسین ہیکل، طبعة السنة المحمدیة ۱۹۶۳ء
۱۰۲- دیوان ابن الرومی، شرح شیخ محمد شریف سلیم ۱۹۷۱م
۱۰۳- دیوان ابن معتز، دار بیروت للطباعة والنشر ۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۱ء
۱۰۴- دیوان ابی تمام، شرح الخطیب التبریزی، تحقیق محمد عبده عزام
۱۰۵- دیوان امرء القیس، دار بیروت للطباعة والنشر ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸م
۱۰۶- دیوان أوس بن حجر، تحقیق و شرح ڈاکٹر یوسف نجم، دار صادر بیروت ۱۹۶۰م
۱۰۷- دیوان البحتری، شرح حسن کامل الصیرفی ۱۹۶۴م
۱۰۸- دیوان جریر، دار صادر بیروت ۱۹۶۰م
۱۰۹- دیوان حسان بن ثابت انصاری، بیروت ۱۹۶۶م
۱۱۰- دیوان الحماسه، ابو تمام، تحقیق محمد عبدالسنعم خفاجی ۱۹۵۵م
۱۱۱- دیوان زهیر بن ابی سلمٰی، دار صادر بیروت ۱۹۵۳م
۱۱۲- دیوان عبید بن الابرص، دار بیروت ۱۹۵۸م

Marfat.com

۱۱۳- دیوان المتنبی ۱۲۱۷ھ
۱۱۴- دیوان النابغه الذبیانی، مطبع مصباح بیروت ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۹م
۱۱۵- روح الدین الاسلامی، عفیف عبدالفتاح طبّاره، قاهره ۱۹۵۹ء
۱۱۶- السیرة النبویة، ابو محمد عبدالملک بن ہشام، مطبعة مصطفی البابی قاهره ۱۹۵۵ء
۱۱۷- شرح دیوان امرء القیس، ہندوستانی ایڈیشن ۱۳۲۴ھ
۱۱۸- شرح دیوان جریر، تحقیق محمد اسماعیل عبدالله الصاوی ۱۳۵۳ھ
۱۱۹- الشراء الصعالیک فی العصر الجاہلی، ڈاکٹر یوسف خلیف، دارالمعارف، مصر ۱۹۵۹م
۱۲۰- شعراء النصرانیة بعد الاسلام، لویس شیخو الیسوعی، المطبعة الکاثولیکیة للآباء
۱۲۱- الیسوعین بیروت ۱۹۲۴ء
۱۲۲- شعراء النصرانیة قبل الاسلام، لویس شیخو الیسوعی، مطبعة الآباء المرسلین الیسوعین بیروت ۱۸۹۰م
۱۲۳- العمدة، ابن رشیق القیروانی، المکتبة التجاریة الکبریٰ ۱۹۳۴م
۱۲۴- فقه السیرة، محمد الغزالی، قاهره ۱۹۵۲م
۱۲۵- القائد الی عیون العقائد، حمید الدین فراہی، اعظم گڑھ ۱۳۹۵ھ /۱۹۷۵م
۱۲۶- الکتاب۔ سیبویه، مکتبة الامبریه بولاق مصر ۱۳۱۶ھ
۱۲۷- کتاب الاشارة الیٰ الایجاز بعض انواع المجاز
۱۲۸- کتاب الأغانی، ابو الفرج اصفہانی، دارالثقافة بیروت ۱۹۵۷م
۱۲۹- کتاب الامثال، ابو منصور عبدالملک ابن محمد بن اسماعیل، دارالکتب العربیة، مصر
۱۳۰- کتاب الحیوان، ابو عثمان عمرو بن بحر الجاحظ، مکتبة مصطفی البابی الحلبی، مصر
۱۳۱- کتاب الصناعتین، ابو ہلال الحسن بن عبدالله بن سہل العسکری دار احیاء الکتب العربیة، قاهره ۱۹۵۲ء
۱۳۲- لسان العرب، ابن منظور دار الطباعة والنشر ۱۹۵۵م - ۱۹۵۶م
۱۳۳- مختارات، ابن الشجری، تحقیق محمد حسن زنانتی ۱۹۳۵ء
۱۳۴- المخصّص، ابوالحسن علی بن اسماعیل ابن سیدة، بیروت
۱۳۵- مشکوٰة المصابیح، ولی الدین محمد عبدالله تبریزی

Marfat.com

۱۳۶- المفضلیات ، شرح حسن السندوبی، ابوالعباس المفضل بن محمّد الضّبی المکتبة التجاریة الکبریٰ ، مصر ۱۳۴۵ھ

۱۳۷- المہلہل، فوأد افرام البستانی، بیروت ۱۹۳۹م

۱۳۸- نزہة الخواہر و بہجة المسامع والنواظر، عبدالحئی بن فخر الدین الحسنی، دائرة المعارف حیدر آباد ۱۹۴۷م

۱۳۹- ہذہ سبیلی، ترجمان جامعة الامام محمد بن سعود، الریاض، ۱۹۸۲ء

۱۴۰- اسلام اور عصر جدید، سہ ماہی، ڈاکٹر سید عابد حسین، جولائی ۱۹۷۶ء

۱۴۱- الاصلاح، ماہنامہ، امین احسن اصلاحی، مارچ، اپریل، مئی ۱۹۳۶ء اعظم گڑھ

۱۴۲- اقسام القرآن، حمید الدین فراہی، مکتبہ چراغ راہ، کراچی ۱۹۵۳ء

۱۴۳- الفاظ القرآن، فقیر اللہ لاہوری، لاہور۔ ۱۳۳۱ھ

۱۴۴- برناباس، آسی ضیائی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۸۲ء

۱۴۵- بیان القرآن۔ اشرف علی تھانوی۔ کتب خانہ رحیمیہ دیوبند

۱۴۶- تجارتی سود۔ تاریخی اور فقہی نقطۂ نظر سے۔ فضل الرحمٰن، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۷ء

۱۴۷- تدبر قرآن۔ اول تا ہشتم، امین احسن اصلاحی۔ فاران فاؤنڈیشن لاہور ۱۹۶۷ء-۱۹۸۰ء

۱۴۸- ترتیب نزول قرآن۔ پروفیسر محمد اجمل خاں ایم اے۔ کتاب گھر الہ آباد ۱۹۴۱ء

۱۴۹- ترجمان القرآن اول تا چہارم۔ ابوالکلام آزاد، ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی ۱۹۶۴-۱۹۷۰ء

۱۵۰- تفسیر قرآن۔ سر سید احمد خاں۔ رفاہ عام پریس لاہور

۱۵۱- تفہیم القرآن۔ اوّل تا ششم، سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۵۸ء

۱۵۲- جواز سود مع فتاویٰ۔ سید طفیل احمد منگلوری، بدایوں ۱۹۳۵ء

۱۵۳- حقیقۃ الربا۔ اقبال سہیل۔ نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۶ء

۱۵۴- الحقوق والفرائض۔ حافظ محمد نذیر احمد۔ کہنہ لیتھو پریس دہلی

۱۵۵- دعوت دین اور اس کا طریق کار۔ امین احسن اصلاحی۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی

۱۵۶- رسول اکرم کی حکمت انقلاب۔ سید اسعد گیلانی۔ کریسنٹ پبلشنگ کمپنی علی گڑھ

۱۵۷- ریاض القرآن۔ محمد عزیز الدین۔ کشمیری بازار۔ لاہور ۱۹۲۹ء

۱۵۸- سیارہ ڈائجسٹ۔ قرآن نمبر حصہ اول و دوم۔ نعیم صدیقی۔ لاہور

۱۵۹- سیرت سرور عالم۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ لاہور ۱۹۸۰ء

۱۶۰- قصص القرآن۔ حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی

۱۶۱- لغات القرآن۔ عبدالرشید نعمانی و عبدالدائم جلالی۔ ندوۃ المصنفین دہلی

Marfat.com

۱۶۲- مبادی تدبر قرآن۔امین احسن اصلاحی۔مکتبہ چراغ راہ کراچی
۱۶۳- مجموعہ تفاسیر فراہی۔مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی لاہور۔پاکستان
۱۶۴- مشکلات القرآن۔داؤد اکبر اصلاحی۔دانش گاہ پنجاب فرنگ لاہور
۱۶۵- مفتاح کنوز القرآن۔کاظم بک کارخانۂ وطن لاہور ۱۹۳۷ء
۱۶۶- مقالات سلیمان۔دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۷۱ء
۱۶۷- نجوم الفرقان۔فلوگل۔فیض بخش ایجنسی۔فیروز پور ۱۹۰۷ء
۱۶۸- نظام القرآن۔حمید الدین فراہی۔دائرہ حمیدیہ اعظم گڑھ
۱۶۹- ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں۔پروفیسر محمد سالم قدوائی۔مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۷۳ء

Marfat.com

قرآنِ مبین کے ادبی آسلوب

عبیداللہ محمد فلاحی

Q
297.16
ف 848 ق
95687

Marfat.com